TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222791

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٨٩١٥٤٣١-٩ Accession No. ٢٢٩٩٩

Author G2999

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

فہرست مضامین

موازنہ انیس و دبیر

مصنفہ علامہ شبلی

Checked 1979

مضمون	صفحہ
تمہید	۳
مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ	۷
عرب کی مرثیہ گوئی	،،
فارسی مرثیہ گوئی	۱۱
اردو میں مرثیہ کی ابتدا اور اسکی ترقی	۱۸
میر انیس	۲۴
میر انیس کے محاسن شاعری	۳۰
فصاحت	۳۲
کلام کی فصاحت	۳۳
کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا	۳۹
روزمرہ	۴۰
مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال	۴۲
بحر و ردیف و قافیہ کی موزونی	۴۳
بلاغت	۴۷
بلاغت کی تعریف	۴۷
ہر قسم کے مضمون کے بلاغت کے جداگانہ طریقے	۵۱
اشخاص کے لحاظ سے بلاغت کا انداز	۵۳
دشمن کی تعریف میں بلاغت کا انداز	۶۲
تسلسل بیان	۶۴
بلاغت کی جزئیات اور اسکی مثالیں	۶۸
استعارات اور تشبیہات	۸۳
صنائع و بدائع	۹۰
جذبات انسانی اور اسکی مثالیں	۱۰۱
مناظر قدرت	۱۴۷

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
صبح کا سماں	۱۴۸	سلام	۲۴۰
گرمی کا سماں	۱۵۱	رباعیات	۲۴۲
منظر یعنی کسی حالت کا سماں اور اسکی مثالیں۔	۱۵۴	میر انیس کے کلام پر اعتراضات	۲۴۴
		سرقات	۲۵۲
واقعہ نگاری	۱۷۸	انیس اور دبیر کا موازنہ	۲۵۵
میر انیس کی واقعہ نگاری کی خصوصیات	۱۸۰	مرزا دبیر کے کلام کے عیوب	۲۵۶
واقعہ نگاری کی مثالیں	۱۸۳	فصاحت کا نہ ہونا	۲۵۷
رزمیہ	۲۱۲	بندش کی سستی اور ناہمواری	۲۵۹
ہنگامۂ جنگ	۲۱۵	تعقید	۲۶۸
فوج کی تیاری	۲۱۶	تشبیہ اور استعارے	۲۷۰
حملہ کا زور و شور	۲۱۷	مضمون بندی اور خیال آفرینی	۲۷۴
حریفوں کی باہمی معرکہ آرائی اور فنون جنگ	۲۲۳	بلاغت	۲۸۰
گھوڑے کی تعریف	۲۲۸	انیس و دبیر کے متحد المضمون مرثیے	۲۸۶
تلوار	۲۳۴	اور متحد المضمون اشعار	تا خاتمہ کتاب

تمہید

حامداً و مصلیاً

شمع ہا بردہ ام از صدق بہ خاک شہدا	تا دل و دیدۂ خون نابہ فشانم دادند

فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کر لیا ہے اُس نے لوگوں کو یقین دلایا ہے کہ اُردو شاعری میں زُلف و خال و خط یا جھوٹی خوشامد، رمدّاحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے **میر تقی** کی غزلیت **درد** کا تصوف **غالب** کا فلسفہ شاعری کی جان ہیں لیکن ان بیش بہا خزانوں میں سے بھی، عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے۔ **میر انیس** کا کلام۔ شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے لیکن اُنکی قدردانی کا طغرائے امتیاز صرف اسقدر ہے کہ "کلام فصیح ہوتا ہے، اور بہت اچھا لکھتے ہیں" بدمذاقی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اور **مرزا دبیر** حریف مقابل قرار دیئے گئے اور مدت ہائے دراز کی غور و فکر، کد و کاوش، بحث و تکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کہ ترجیح کا مسند نشین کس کو کیا جائے

اس بنا پر مدت سے یہ ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری، باوجود کم مائگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے اس غرض کیلئے **میر انیس** سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کیلئے موزون نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اُن کے کلام میں شاعری کے جسقدر اصناف پائے جاتے ہیں، اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے، شکر ہے کہ آج اس ارادے کے پورے ہونے کی نوبت آئی، اور یہ کتاب، ناظرین کی خدمت میں پیشکش ہے اس کتاب میں میر انیس کا موازنہ بھی مرزا دبیر سے کیا گیا ہے اور اس مناسبت سے اسکا نام **موازنہ** ہے،

شاعری کیا چیز ہے؟ یہ ایک نہایت مفصل اور دقیق بحث ہے۔ ارسطو نے اس پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عربی زبان میں ابن رشد نے کیا اور اس کا بڑا حصہ چھپکر شائع بھی ہو چکا ہے، ابن رشیق، قیروانی اور ابن خلدون نے اس پر بحث کی ہے۔ انگریزی زبان میں نہایت اعلیٰ درجہ کی کتابیں، اس مسئلہ پر لکھی گئی ہیں جن میں سے بعض میری نظر سے بھی گذری ہیں، گو میں اُن سے اچھی طرح مستفید نہیں ہو سکا۔ **شعر العجم** میں، میں اس مضمون کو انشاء اللہ نہایت تفصیل سے لکھوں گا، یہاں صرف اسقدر کہنا کافی ہے کہ شاعری کے دو جزو ہیں **مادہ و صورت** یعنی کیا کہنا چاہئے اور کیونکر کہنا چاہئے؟ انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سُننے یا کسی حالت، یا واقعہ کے پیش آنے سے، جوش، و مسرت، عشق و محبت، درد و رنج، فخر و ناز، حیرت و استعجاب، طیش و غضب، وغیرہ وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اس کو **جذبات** سے تعبیر کرتے ہیں ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصلی **ہیولیٰ** ہے اُنکے سوا عالم قدرت کے مناظر گرمی و سردی، صبح و شام، بہار و خزاں، باغ و بہار، دشت و صحرا، کوہ و بیابان کی تصویر

کھینچنا، یا عام واقعات اور حالات کا بیان کرنا بھی اسی میں داخل ہے،
لیکن یہ شرط ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے
دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے، یہ شاعری کا دوسرا جزو یعنی اسکی صورت
ہے، اور انہی دونوں جزوں کے مجموعہ کا نام شاعری ہے، باقی خیال بندی، مضمون
آفرینی، دقت پسندی، مبالغہ، صنائع و بدائع، شاعری کی حقیقت میں داخل نہیں
اگرچہ بعض جگہ یہ چیزیں، نقش و نگار اور زیب و زینت کا کام دیتی ہیں۔

میر انیس کی شاعری کو اسی معیار سے جانچنا چاہئے، جس کا مختصراً بیان ہوا،
جس شخص کو یہ معیار تسلیم نہ ہو، اس کے سامنے میر انیس کی نسبت، کمال شاعری کا
دعویٰ نہیں کیا جا سکتا،

میر انیس اور تمام اور مرثیہ گویوں کے کلام میں جن لوگوں کا ذکر اکثر آتا ہے،
اور جو مرثیہ کے ہیرو ہیں، اور اُن کا نام، اور اُن کی خصوصیات ذیل میں اس
غرض سے لکھی جاتی ہیں کہ واقعہ، اور روایت کے سمجھنے میں مدد ملے اور محاسن شعری
اور اسالیب بلاغت کے نکات سمجھ میں آئیں۔

حضرت عباسؑ	حضرت امام حسین علیہ السلام کے بھائی ہیں، اور گو حقیقی بھائی نہیں لیکن حقیقی بھائیوں سے زیادہ مخلص اور جان نثار ہیں، اس خصوصیت کو ہر جگہ دکھایا ہے۔ اس کے ساتھ ان کی شجاعت و بہادری اور جوانانہ جوش کو ہر موقع پر نمایاں کیا ہے،
حضرت زینبؑ	حضرت امام حسین علیہ السلام کی بہن، جو سب سے زیادہ امام علیہ السلام سے محبت رکھتی تھیں، اُنکے دو صاحبزادے تھے، عونؑ و محمدؑ

	دونوں کو اُنہوں نے امام پر نثار کر دیا،
عونؑ و محمدؑ	حضرت زینبؑ کے صاحبزادے۔
حضرت صغریٰؑ	امام حسین علیہ السلام کی چھوٹی صاحبزادی، جن کو امام علیہ السلام مدینہ میں چھوڑ آئے، اُن کی جُدائی اور رُخصت کو تمام مرثیہ گویوں نے بڑے درد اور اثر کے ساتھ لکھا ہے،
حضرت سکینہؑ	امام حسین علیہ السلام کی سب سے چھوٹی صاحبزادی جو قید خانہ کی تکلیفوں سے انتقال کر گئیں، (حسب خیال مرثیہ گویان اُردو)
حضرت علی اکبرؑ	امام حسین علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے ان کو حضرت زینبؑ نے پالا تھا، اور اپنے بیٹوں سے زیادہ اُن کو عزیز رکھتی تھیں، اس بنا پر وہ حضرت زینبؑ ہی کو اپنا مالک و مختار سمجھتے تھے، اور ماں سے زیادہ اُن کا ادب کرتے تھے۔
حضرت علی اصغرؑ	امام حسین علیہ السلام کے شش ماہہ صاحبزادے جن کو دشمنوں نے امام علیہ السلام کی گود میں شہید کیا،
حضرت سجادؑ	امام زین العابدینؑ، جو بیماری کی وجہ سے شریک جنگ ہو سکے تھے اور دشمن اُن کو بیڑیاں پہنا کر، شام تک پیادہ پا لے گئے تھے،
حضرت شہر بانوؑ	امام حسین علیہ السلام کی حرم محترم جو نوشیروان کی پوتی تھیں،
حُرؑ	یزید کے رسالے کا سپہ سالار تھا، لیکن خدا نے ہدایت کی، اور امام علیہ السلام کی فوج میں آکر شامل ہو گیا،

مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ

عرب میں جو فارسی اور اُردو شاعری کا سرچشمہ ہے، شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی، اور یہی ہونا چاہئے تھا، عرب میں شاعری کی ابتدا بالکل فطرت کے اصول پر ہوئی یعنی جو جذبات دلوں میں پیدا ہوتے تھے وہی اشعار میں ادا کر دیئے جاتے تھے جذبات میں درد و غم کا جذبہ اور جذبات سے قوی تر ہے، اور جس جوش سے یہ ظاہر ہوتا ہے اور جذبات ظاہر نہیں ہو سکتے، فرض کرو۔ ایک شخص کے گھر میں بہت تمناؤں کے بعد بیٹا پیدا ہوا، تو اس کو گو بہت کچھ خوشی ہو گی لیکن وہ اس خوشی کو کسی مجمع عام میں اشعار یا خطبہ کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کریگا۔ اور کرے بھی تو کلام میں کوئی غیر معمولی تاثیر نہ ہو گی، لیکن اگر یہی لڑکا مر جائے تو اس کی کیا حالت ہو گی؟ وہ سراپا جوش بنجائیگا، اُس کی آہ و زاری لوگوں کو تڑپا دیگی، اور اگر وہ شاعر ہے۔ تو اس کے مرثیے دلوں پر نشتر کا کام دیں گے،

بہرحال عرب میں چونکہ شاعری کی ابتدا اظہار جذبات سے ہوئی تھی، اس لئے سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی جو سب سے قوی تر جذبہ کا اثر ہے،

مرثیے عین اس حالت میں کہے جاتے تھے، جب کہ شاعر کا دل درد و غم سے لبریز ہوتا تھا، اسکا شاعری پر ایک خاص اثر یہ ہوا کہ قصائد کی ابتدا جو عام طور پر نسیب اور غزل سے کیجاتی تھی، مرثیہ کے قصائد میں یہ طرز متروک ہو گیا، کیونکہ رنج و غم کی حالت میں عشق و محبت کے خیالات کا کیا موقع تھا، عرب میں اسکی مخالف صرف ایک مثال

موجود ہے، یعنی درید بن الصمہ ایک شاعر نے اپنے بھائی کا مرثیہ جو لکھا اُس کی ابتدا غزل سے کی تھی، جس کا مطلع یہ تھا،

اَمِنْ جدید الحبل من اُمِّ معبد	لعاقبہ اوخلفت کل موعد

لیکن اس کی وجہ ابن رشیق نے کتاب العمدہ میں یہ لکھی ہے کہ یہ مرثیہ واقعہ کے پورے ایک برس کے بعد لکھا گیا تھا۔

اگرچہ جاہلیت ہی کے زمانہ میں مرثیہ گوئی کو بہت ترقی ہو چکی تھی، اور بہت سے شعرا نے بڑے بڑے پُر اثر مرثیے لکھے تھے لیکن دو شخص اس زمانہ میں بہت نامور ہوئے **خنساء** اور **متمم بن نویرہ**۔ خنسا ایک عورت تھی جس کو اپنے بھائی **صخر** سے بے انتہا محبت تھی۔ صخر ایک لڑائی میں مارا گیا، خنسا پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ اس کے حواس جاتے رہے، اُس نے صخر کی پھٹی پُرانی جوتیوں کا ہار بنا کر گلے میں ڈالا اور دیوانہ وار پھرنے لگی اسی حالت میں حج کو گئی، یہ حضرت **عمر فاروق** رضؓ کا زمانہ تھا، وہ حرم کا طواف کرتی اور سینہ پر دو ہتھڑ مارتی جاتی تھی، حضرت عمرؓ نے دیکھا تو ڈانٹا، اُس نے اپنی داستان بیان کی حضرت عمرؓ نے کہا ہاں! لیکن ماتم کے اس طریقے کو اسلام نے مٹا دیا، وہ اور بیتاب ہو گئی، اور اُسوقت بے اختیار اُسکی زبان سے چند شعر نکلے جن کا مطلع یہ ہے،

ھریقی من دموعک وا ستفیقے	وصبرًا ان اطقت ولم تطیقے

(اپنے نفس سے مخاطب ہو کر) آنسو بہا اور اُس سے تسلی حاصل کر اور صبر کر اگر تجھ سے کیا جائے لیکن تو کر نہیں سکنے کی،

متمم بن نویرہ بھی اُسی زمانہ میں تھا اور وہ بھی اپنے بھائی کا شیفتہ اور عاشق تھا۔

ایک لڑائی میں خالد بن الولید نے اسکے بھائی کو مار ڈالا۔ اس پر متمم کی یہ حالت ہوئی کہ گھر بار چھوڑ کر نکلا، اور قبائل عرب میں پھرنا شروع کیا، جہاں پہنچتا تھا تمام زن و مرد اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے، وہ درد انگیز لہجہ میں مرثیہ پڑھتا، اور ہر طرف سے گریہ و زاری کی آواز بلند ہوتی، اس کی یہ حالت دیکھکر لوگوں نے سمجھایا کہ تم جلد ہلاک ہو جاؤ گے اور تمہارے خاندان کی کوئی یادگار باقی نہ رہے گی، اسلئے تم شادی کر لو کہ اولاد کے ذریعہ سے خاندان کا نام رہ جائے"

لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر اُس نے شادی کی، لیکن بیوی کی طرف التفات نہ کر سکا، آخر طلاق دینی پڑی،

اسی حالت میں حضرت عمرؓ کے پاس آیا، وہ اسوقت مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے، متمم نے مرثیہ کے اشعار پڑھنے شروع کئے، حضرت عمرؓ اگرچہ نہایت مضبوط دل کے آدمی تھے، لیکن ضبط نہ کر سکے، بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے متمم مرثیہ پڑھ چکا تو حضرت عمرؓ نے کہا "الی ما بلغ بك الحال" یعنی تیرے غم کی حالت کس حد تک پہنچی ہے؟ اُس نے کہا امیر المومنین! بچپن میں مجھ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا جسکی وجہ سے میری بائیں آنکھ کی رطوبت جاتی رہی تھی، میں کبھی روتا تھا تو اس آنکھ سے آنسو نہیں نکلتے تھے، بھائی کے مرنے کے بعد جو اُس آنکھ سے آنسو جاری ہوئے تو اب تک نہ تھمے،

حضرت عمرؓ نے اُس سے فرمائش کی کہ اُن کے بھائی زید کا مرثیہ لکھے، اُس نے فرمائش پوری کی، لیکن جب دوسرے دن جا کر حضرت عمرؓ کو سنایا، تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں تو وہ درد نہیں پاتا، اُسنے کہا امیر المومنین! زید آپکے بھائی تھے میرے بھائی نہ تھے،

اس زمانہ تک مرثیہ صرف وہ لوگ کہتے تھے جن پر کوئی غیر معمولی حالت طاری ہوتی تھی اُس کے بعد جب شاعری اصلی حالت سے بدل کر کسب معاش کا ذریعہ بنی تو مرثیہ گوئی کو خود بخود زوال ہوا کیونکہ مدحیہ قصائد کی طرح اس سے کچھ صلہ نہیں مل سکتا تھا، تاہم چونکہ عرب میں ابھی تک قدیم اوصاف کچھ باقی تھے، اسلئے بعض مرثیے اس زمانہ کے بھی ایسے ملتے ہیں جن میں اثر اور جوش پایا جاتا ہے،

اسی زمانہ میں کربلا کا قیامت انگیز واقعہ پیش آیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ اگر عرب کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اُس روز کے مرثیے لکھے جاتے کہ تمام دنیا میں آگ لگ جاتی، لیکن اُدھر تو عرب کے پُرزور جذبات میں انحطاط آچکا تھا، اور ادھر بنو امیہ کی ظالمانہ سطوت اور جبّاری نے تمام شعرا کی زبانیں بند کردی تھیں، فرزدق بنو امیہ کے پہلے تخت کا شاعر تھا، لیکن جب اُس نے ایک موقعہ پر نوری جوش سے حضرت امام زین العابدین کی مرح میں فی البدیہہ چند شعر کہے تو عبد الملک بن مروان نے اُس کو حبس خانہ میں بھجوا دیا،

بنو امیہ کے بعد دولت عباسیہ کا دور آیا۔ اس عہد میں شاعری کو بہت ترقی ہوئی لیکن اُنہی اصناف کو ترقی ہوئی جن کو صلہ اور انعام سے تعلق تھا، اسلئے مرثیہ گوئی اب بھی اُسی حالت میں رہی،

البتہ معن اور جعفر برمکی کی فیاضیوں نے ایک عالم کو ممنون احسان بنا رکھا تھا، اسلئے اُنکے مرنے پر جو مرثیے لکھے گئے[1] اُن میں سے اکثر پُراثر اور دردانگیز ہیں،

---

[1] عرب کی مرثیہ گوئی کا مضمون آیندہ نہایت وسیع مضمون ہے لیکن ہم کو اقتضائے مقام سے نہایت اختصار کرنا پڑا، کتاب العمدہ ابن رشیق نے باب المراثی میں اس پر مفصل بحث کی ہے،

فارسی شاعری کی بنیاد تکلف آورد، اور مدّاحی پر قائم ہوئی تھی، اس لئے شاعری کے وہ انواع جن کو جذبات سے لازمی تعلق تھا دفعتہً پستی کی حالت میں آگئے تاہم چونکہ آغاز میں ہر چیز میں فطرت کا اثر پایا جاتا ہے، اسلئے فردوسی اور فرخی وغیرہ کی شاعری میں جا بجا جذبات کا اظہار بہت خوبی کے ساتھ نظر آتا ہے، فارسی مرثیہ

فردوسی نے سہراب کا مرثیہ جو اس کی ماں کی زبان سے لکھا ہے، اسکے اشعار سے اس کا اندازہ ہو سکے گا،

بمادر خبر شد کہ سہراب گرد — ز تیغ پدر خستہ گشت و بمرد
خروشید و جوشید و جامہ درید — بزاری، بروں کودک نارسید
بزو چنگ و پدرید پیراہنش — درخشاں شداں لعل زیبا تنش
برآورد بانگ و بغلبود مروش — زماں تا زماں زو ہمی رفت ہوش
فرو برد ناخن دو دیدہ بکند — برآورد بالا در آتش فگند
سر آں زلف چوں تاب دادہ کمند — بہ انگشت پیچید و از بن بکند
رداں گشت از رخ او جوئے خوں — زماں تا زماں اندر آمد نگوں
ہمہ خاک تیرہ بسر بر فگند — بدنہاں زبانزد بے خود گشت کند
بسر بر فگند آتش و بر فروخت — ہمہ موئے مشکین بآتش بسوخت
ہمے گفت کالے جان مادر کنوں — کجائی سرشتہ بخاک و بخوں
دو چشم برہ بود گفتم مگر — ز سہراب و رستم بیابم خبر
گمانم چناں بود گفتم کنوں — بہ گشتی بگرد جہاں اندروں
پدر را ہمے جستی و یافتے — کنوں بآمدن نیز بشتافتے

چه دانستم اے پور کاید خبر
که رستم به خنجر دریدت جگر

دریغش نیامد ازاں روئے تو
وزاں بر ولائے و بانوئے تو

پرورده بودم تنش را بناز
بر خشنده روز و شبان دراز

کنوں آں بخوں اندروں غرقه گشت
کفن بر تن پاک او خرقه گشت

کنوں من کرا گیرم اندر کنار
که خواهد بدن مرمرا غمگسار

کرا گویم ایں درد و تیمار خویش
کرا خوانم اکنوں بجائے تو پیش

پدر بستی اے گرد لشکر پناه
بجائے پدر گورت آمد براه

از امید نا امید گشتی نوزار
بخفتی بخاک اندروں زار و خوار

زاں پیش کو دشنه را برکشید
جگرگاه سیمین تو بر درید

چرا آں نشانے که مادرت داد
نداوی بر و بر نگر و بش یاد

نشاں داده بد از پدر مادرت
زبهر چه نامد همے با درت

کنوں مادرت ماند بے تو اسیر
پر از درد و تیمار و رنج و زحیر

چرا آمدم با تو اندر سفر
که گشتی بگرداں گیتی سمر

مرا رستم از دور بشناختے
ترا با من اے پور نپرداختے

بینداختی تیغ آں سرفراز
نکردی جگرگاه ت اے پور باز

همے گفت و بے خست و میکند موے
همے زد کف دست بر تن بروے

همے گفت مادرت بیچاره گشت
به خنجر جگرگاه تو پاره گشت

اسی زمانہ کے قریب سلطان محمود کی وفات پر فرخی نے مرثیہ لکھا جو نہایت مؤثر اور درد انگیز ہے، ۵

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم یار
چہ فتاد است؟ کہ امسال دگر گون شد کار

کو سُہا بینم پر شورش و سرتاسر کوے
ہمہ پُر جوشن و خفتان و پُر خیل و سوار

فلک امسال دگر باز نیامد زعزا
دُشمنے روئے نہاد است دریں شہر و دیار

آہ و درد اکہ یکبارہ نہی مینیم ازو
کاخ محمودی و آں خانۂ پر نقش و نگار

سیر مے خوردہ مگردی، و نخفتہ است امروز
دیر تر خاست، مگر رنج رسیدش ز خمار

خیز شاہا! کہ رسولانِ شہاں آمدہ اند
ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار

کہ تواند؟ کہ برانگیزد ازیں خواب ترا
خفتنی خفتی، کس خواب نگردی بیدار

خفتن بسیار اے خسرو! خوئے تو نبود
ہیچ کس خفتہ ندیدست ترا زیں کردار

یک دمک ابا رے دمخانہ بیالیست نشست
تا بدیدندے رخے تو عزیزاں دِ نثار

بحصار از فزع دیم تو رفتند شہاں
تو شہا از فزع دیم کہ رفتی بکنار

شعرا را تو بازار بر افروختہ بود
رفتی و با تو یکبارہ برفت آں بازار

اس دور کے بعد مرثیے بہت کم لکھے گئے اور جو لکھے گئے وہ صرف رسمی مرثیے تھے ان سے شاعری کے تمام اقسام پر فائز ہونے کا اظہار مقصود تھا، البتہ شیخ **سعدی** اور امیر **خسرو** کے دو مرثیے بہت مشہور ہیں، اور چونکہ دل سے نکلے ہیں حسرت خیز اور درد انگیز ہیں، لیکن چونکہ اس زمانہ کی عیش و طرب کی مجلسیں غزل کے ترانوں سے گونج رہی تھیں اسلئے اس کا اثر عام نہیں ہوا، جب صفویہ اور تیموریہ دور آیا تو شاعری نے ایک دوسرا قالب اختیار کیا، اور سنائی، انوری، عرفی، کی زور آوریوں نے پرانی بنیادیں مٹا کر نئی عمارتیں قائم کیں، اس زمانہ میں محتشم کاشی نے عام دستور کے موافق شاہ طہماسپ صفوی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا طہماسپ

کو خاندان رسالت سے عشقیہ نیازمندی تھی، اس بنا پر اُس نے کہا کہ میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ میری مدح میں قصائد لکھے جائیں، شعرا کو ائمہ اہل بیت کی شان میں طبع آزمائی کرنی چاہیئے، جس کا اصلی صلہ خدا کے دربار سے ملیگا اور دنیوی تمتعات دربار شاہی سے حاصل ہونگے، محتشم نے اس خواہش کے موافق آٹھ بندوں کا ایک مرثیہ لکھا جو درد و غم کی مجسم تصویر ہے، اور جس کا جواب آجتک نہ ہوسکا، اس مرثیہ کے چند بند یہ ہیں،

مرثیہ محتشم کاشی

چوں خون ز حلق تشنہ او بر زمیں رسید
چوں از زمیں بہ ذروۂ عرش بریں رسید

نخل بلند او چو خساں بر زمیں زدند
طوفاں بہ آسماں ز غبار زمیں رسید

باد آں غبار چوں بمزار نبی رساند
گرد از مدینہ بر فلک ہفتمیں رسید

کرد ایں خیال وہم غلط کار کاں غبار
تا دامن جلال جہاں آفریں رسید

ہست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال
اندر دل است و ہیچ دلے نیست بے ملال

ترسم جزائے قاتل او چوں رقم زنند
یکبار بر جریدۂ رحمت قلم زنند

ترسم کزیں گناہ شفیعان روز حشر
دارند شرم کز گنہ خلق دم زنند

دست عتاب حق بدرید آبد از آستیں
چوں اہلبیت، دست بر اہل ستم زنند

آہ از دمے کہ پاکفن خوں چکاں ز خاک
آل علی چو شعلۂ آتش علم زنند

فریاد از اں زماں کہ جواناں اہل بیت
گلگوں قدم بہ عرصۂ محشر قدم زنند

از صاحب حرم چہ توقع کنند باز | آں ناکساں کہ تیغ بصید حرم زنند

بس بر سناں کنند سرے را کہ جبرئیل
شوید غبار گیسوئش از آب سلسبیل

بر خرگاہ چوں رہ آں کاروان فتاد | شور نشور واہمہ را در گماں فتاد
ہم بانگ نوحہ غلغلہ در شش جہت فگند | ہم گریہ بر ملائک ہفت آسماں فتاد
چنداں کہ ہر زناں شہدا چشم کار کرد | بر زخمہائے کاری تیغ و سناں فتاد
ناگاہ چشم دختر زہرا دراں میاں | بر پیکر شریف امام زماں فتاد
بے اختیار نعرہ ھذا حسین ازو | سر زد چنانکہ آتش ازو در جہاں فتاد

پس بانوياں پرگلہ آں بضعۃ البتول
رو در مدینہ کرد کہ یا ایہا الرسول

ایں کشتہ فتادہ بہ ہامون حسین تست | ایں صید دست و پا زدہ در خون حسین تست
ایں غرقہ محیط شہادت کہ روئے دشت | از موج خون او شدہ گلگون حسین تست
ایں خشک لب فتادہ ممنوع از فرات | کز خون او زمیں شدہ جیحون حسین تست
ایں شاہ کم سپاہ کہ با خیل اشک و آہ | خرگاہ ایں جہاں زدہ بیرون حسین تست
ایں قالب طپاں کہ تپیں ماندہ بر زمیں | شاہ شہید ناشدہ مدفون حسین تست

پس روئے در بقیع بہ زہرا خطاب کرد
وحش زمیں و مرغ ہوا را کباب کرد

لہ ایک بند اس سے پہلے کا چھوڑ دیا گیا ہے جس میں یہ بیان ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد مخالفین اہل حرم کو بے عماری کے اونٹوں پر سوار کر کے شہدا کی لاشوں کے سامنے سے لیگئے ۱۲

کای مونس شکستہ دلاں حال ما ببیں
ما را غریب و بیکس و بے آشنا ببیں

تنہائے کشتگاں ہمہ در خاک و خون نگر
سرہائے سروراں، ہمہ بر نیزہا ببیں

آں سر کہ بود بر سر دوشِ نبی مدام
یک نیزہ اش ز دوش مخالف جدا ببیں

واں تن کہ بود پرورشش در کنار تو
غلطاں بخاک معسکر کربلا ببیں

در خلد بر حجاب دو کون آستیں فشاں
واندر جہاں مصیبت ما بر ملا ببیں

نے نے ورا جوابر خرو شاں بگر بلا
طغیان سیل فتنہ و موج بلا ببیں

یا بضعۃ البتول ز ابن زیاد داد
کو خاک اہل بیت رسالت بباد داد

مخمّس کے مرثیہ کو اگرچہ حد سے بڑھکر حسن قبول حاصل ہوا، اور دربار شاہی سے صلہ اور انعام بھی ملا، لیکن تمام ملک میں قصیدہ اور مدح کا رنگ اسقدر چھایا ہوا تھا کہ عام شعرا پر اس کا چنداں اثر نہیں پڑا، طالب عاملی، غزالی، میلی، سلیم، کلیم، وغیرہ شعرائے متاخرین کے کلام میں اور سب اصناف سخن پائے جاتے ہیں لیکن مرثیہ کا پتہ بہت کم چلتا ہے۔ حاجی محمد جان قدسی نے اپنے بیٹے کا جو نوجوان مرگیا تھا نہایت پُر درد مرثیہ لکھا، لیکن نوادہ رسالت کے غم میں دو شعر بھی نہ لکھے ظہوری نے البتہ بہت سے مرثیے لکھے، لیکن وہ اپنا دلی جوش نہ تھا، بلکہ ابراہیم عادل شاہ کی خوشامد تھی، چنانچہ اکثر مرثیوں کے خاتمہ میں **ابراہیم عادل شاہ** کا نام اس طرح آتا ہے جس طرح قصائد میں تشبیب کے بعد گریز۔

ایک بند کے خاتمہ کا شعر ہے ؎

سر کن ز روئے صدق **ظہوری** رہ دعا
از گفتگو، دعائے شہنشاہ مدعاست

خود کہتا ہے کہ مرثیہ سے صرف بادشاہ کی دعا مقصود ہے،
ایک اور مرثیہ کا خاتمہ ہے ؎

ایام ازاں بکام حسینؑ و حسن نبود	کاں روز شہریار سریر و کن نبود

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں ؎

روزے کہ سرورِ شہدا بے سپاہ بود	ہنگام کارزار براہیم شاہ بود

اس خوشامد کا کیا ٹھکانا ہے کہ حسین علیہ السلام کی ناکامیابی کی یہ وجہ تھی کہ اس زمانہ میں بادشاہ دکن موجود نہ تھا،

محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی کی طرف خاص توجہ کی، اُس نے مرثیہ ہی کو شاعری کا موضوع قرار دیا، نہایت کثرت سے مرثیے لکھے، اور بڑا کام یہ کیا کہ کربلا کے تمام واقعات، ابتداءِ سفر سے لیکر اہل حرم کے قید ہونے اور رہائی پاکر مدینہ میں آنے تک، سادہ طریقہ پر لیکن تفصیل کیساتھ ان مرثیوں میں ادا کر دیئے، اُسکے مرثیوں کو مرثیہ کی بہ نسبت تاریخ کہنا زیادہ موزون ہے، اس غرض کیلئے اُس نے ترکیب بند وغیرہ چھوڑ کر مثنوی کا طریقہ اختیار کیا، اور مثنوی میں بھی قدیم معمولی بحریں اختیار نہیں کیں، بلکہ قصائد کی بحر انتخاب کی، تاکہ ہر قسم کے مطالب بھی تفصیل کے ساتھ بیان ہوسکیں اور سوز خوانی کے کام بھی آئیں، کیونکہ مثنوی کی مروجہ بحروں میں سوز خوانی کے اُتار چڑھاؤ کی کھپت نہیں ہوسکتی تھی،

مقبل کے مرثیوں میں اگرچہ وہ زور اور بندش کی چستی نہیں ہے، جو اس دور کا خاصہ ہے لیکن درد اور تاثیر سے خالی نہیں، نمونہ کیلئے ہم صرف چند شعر لکھتے ہیں ؎

مخدرات بہ عباس در سخن بودند	برائے رفتن او در گریستن بودند

کہ از درونِ سرا پردہ با فغان و خروش	سکینہ آمد و یک مشک خالی بر دوش
دواں بخدمت عمّ بزرگوار آورد	چنانکہ اہل حرم را بزار زار آورد
بگریہ گفت کہ اے عمّ خوش قرینۂ من	رسید جاں بلب از تشنگی سینۂ من
چہ دافع است کہ ما ہمچو خلق دور انیست	چہ شد کہ جرعہ آبے دریں بیاباں نیست
چو دید حضرتِ عباس بے قراری او	گسیخت بند دلش از فغاں و زاری او

مقبل کے بعد ایران میں مرثیہ گویوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہو گیا، اور مرثیہ کے اور بہت سے اقسام پیدا ہو گئے مثلاً نوحہ، پیش خوانی وغیرہ،

ہندوستان میں شاعری کی ابتدا **ولی** سے ہوئی، ولی نے اگرچہ کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی لیکن اُسکے کلام میں مرثیہ کا پتہ نہیں لگتا، یہ معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس نے کی، لیکن اسقدر یقینی ہے کہ سودا اور میر سے پہلے مرثیہ کا رواج ہو چکا تھا، سودا نے اپنے شہر آشوب میں میاں **مسکین** مرثیہ گو کا ذکر کیا ہے ؎

اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا	پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

میر تقی صاحب کے دیوان میں اگرچہ کوئی مرثیہ نہیں، لیکن اُنہوں نے بھی کہا ہے، اُن کے ایک مرثیہ کا رد مرزا سودا نے لکھا ہے، جسکے چند شعر یہ ہیں ؎

دلوں پر محبّوں کے حالت عجب ہے	مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے	حسینؑ علیؑ کی شہادت کی شب ہے
کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوگا	وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا	قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جواب ہے
بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہائے	یہ کشتی فلک کی بھنور میں ڈبائے

شہ تشنہ لب کا کیسے غم سنائے　　یہ کس منہ سے کہیئے کہ وہ تشنہ لب ہے

اُس وقت تک مرثیے عموماً چومصرع ہوتے تھے، غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا جو اُن کے دیوان میں موجود ہے، اُردو میں مرثیہ کی وسعت اور ترقی کا یہ پہلا قدم تھا، کیونکہ چومصرع میں اوّل سے آخر تک ایک خاص قافیہ کی پابندی کیوجہ سے ہر قسم کے مطالب نہیں ادا کئے جا سکتے تھے،

میر انیس کے اس مصرع سے ع پانچویں پُشت ہے شبیر کی مدّاحی میں ثابت ہوتا ہے کہ میر ضاحک صاحب نے جو میر انیس کے پردادا اور سودا کے معاصر تھے۔ اور میر حسن اُن کے بیٹے نے بھی مرثیہ لکھا ہے، لیکن ضاحک کا کلام تو سرے سے مفقود ہے میر حسن کا دیوان مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا، یاد نہیں آتا کہ اس میں مرثیہ بھی ہے یا نہیں۔

یہ امر تعجب سے خالی نہیں کہ میر تقی، اور مرزا سودا جیسے قادر الکلام نے بھی مرثیہ کو چنداں ترقی نہیں دی، اور میر ضمیر تک یہ فن گویا ابتدائی ہی حالت میں رہا، چنانچہ سودا کے مسدس کا ایک بند ہم نقل کرتے ہیں، جس سے اس زمانہ کی مرثیہ گوئی کا اندازہ ہوگا، ؎

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی　　جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذادی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی　　یاں تلک پہنچی ہے ملعون تری بیدادی

کون فرزند علیؑ پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اُسکے تو نہیں ڈرتا ہے

خویش و فرزند و عزیز اُسکے تھے جتنے پیارے　　دشنہ و تیغ سے ہیں ظالموں کے سب مارے
اہل بیت اُسکے جو باقی ہیں سو ہیں آوارے　　قیدیں کوفیوں کے جاتے ہیں وہ بیچارے

نہ آہیں چین ہے دن کو نہ انہیں رات آرام اس مصیبت میں چلے جاتے ہیں کربل کو شام	

شاید یہ خیال ہو کہ اس وقت تک شعرا، مرثیہ کو محض ایک مذہبی فرض سمجھتے تھے اور اس وجہ سے شاعرانہ طباعی اور زور آوری سے اجتناب کرتے تھے، انکا مقصد صرف رونا رُلانا ہوتا تھا، جس کو شاعری سے تعلق نہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، مرزا سودا میر تقی کے مرثیہ کی رد کی تمہید میں لکھتے ہیں،

"لیکن مشکل ترین دقائق طریقہ مرثیہ کا معلوم کیا، کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی دیا، اس کام میں مخمس ساکسو نے عزقبول نہیں پایا، بس لازم ہے کہ مرثیہ در نظر رکھکر مرثیے کہے نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے"

اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ مرزا مرثیہ کو مشکل ترین فنون سمجھتے تھے، اور اُس کا مقصد محض گریہ عوام نہیں قرار دیتے تھے،

غرض اس زمانہ میں جو ترقی ہوئی وہ صرف اسقدر تھی کہ مرثیے چومصرع سے مسدس ہو گئے، سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا، وہ میر ضمیر، مرزا دبیر کے اُستاد ہیں، میر ضمیر کے مرثیے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، اُنہوں نے مرثیہ میں جو جدتیں پیدا کیں، حسب ذیل ہیں،

۱، رزمیہ لکھا،

۲، سراپا ایجاد کیا،

۳، گھوڑے، تلوار اور اسلحۂ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے، اور یہی مضامین آج موجودہ مرثیوں کے مہمات موضوع ہیں۔

۴، واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی، چنانچہ ایک ایک جزئی واقعہ کو تفصیل کے ساتھ لکھا،
۵، سب سے بڑھکر یہ کہ کلام میں زور، اور بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی، غلط الفاظ جو مرثیوں کیلئے گویا جائز مان لئے گئے تھے اکثر ترک کر دیئے، اُن کے عمدہ کلام کا اگر انتخاب کیا جائے تو میر انیس کا کلام معلوم ہوگا،

اب اس سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے، اب تحت لفظ کا بھی رواج ہوا اور غالباً پہلا شخص جس نے منبر پر بیٹھکر تحت لفظ پڑھا میر ضمیر صاحب تھے

نئی تشبیہات۔ لطیف استعارے۔ مبالغہ۔ واقعہ نگاری۔ مناظر قدرت کی تصویر غرض میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کے جس قدر محاسن ہیں ضمیر کے ہاں سب پائے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میر ضمیر کے ہاں اُن کا رنگ ہلکا تھا، ان دونوں صاحبوں نے شوخ کر دیا۔ میر ضمیر کے ہر نمونے کے چند اشعار ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

جا کے میدان میں کس طرح یہ محبوب لڑے	یہ تو کہیئے کہ غلام آپکے کچھ خوب لڑے
چاہتا تھا کہ کروں ضبط پہ چیرے ہتا تھا	پوچھو اکبر سے میں ہر ہاتھ پہ کیا کہتا تھا
چیر کر فوج کو اس پار سے اُس پار گئے	میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے
پانی تو پی نہیں حیدر کے نواسے آئے	بولے عباس کہ پیاسے گئے پیاسے آئے
قریب جاتے ہی ہندہ نے اُنکا تھاما ہاتھ	کہا سلام علیک اے ضعیفہ نیک صفات
وہاں سے لائے اُٹھا کر تو پھر کہی یہ بات	سمجھ میں کچھ نہیں آتے ہیں آپکے حالات

وہ روشنی میں بغور اُن کے منہ کو تکتی تھی
گرچہ قصد تھا۔ پر کچھ وہ کہہ نہ سکتی تھی

کہا یہ ہندہ نے کچھ میں نے تم کو پہچانا	کہیں ہے شہر مدینہ میں ظاہر اد یکھا

روزمرہ اور صفائی

واقعہ نگاری

محلہ ہے وہاں مشہور اہل ہاشم کا | ہمیشہ آمد و شد تھی غرض میری اُس جا

ضرور دیکھا ہے آلِ عقیلؑ و جعفرؑ میں
دیا جنابِ سالتماب کے گھر میں

سو اس کلام سے مطلب ہے یہ خدا ہی گواہ | جنابِ فاطمہؑ کے گھر میں ہے تمہیں کچھ راہ
خصوص زینبؑ و کلثومؑ سے بھی ہو آگاہ | ہیں دونوں یہیاں شہر آدیباں مری اللہ

وہ سب تو ایک طرف پر امام اچھے ہیں
کہو حسین علیہ السلام اچھے ہیں

تشبیہ | پنہاں زرہ میں ہوتی تھی اسطرح سے سناں | بجلی چمک کی ہوتی ہے جوں ابر میں نہاں
اس نیزۂ سیاہ سے تھا سب کو بیم جاں | تھا اژدہائے موسیٰ عمراں کی وہ زباں

نیزہ کی یہی تشبیہ ہے جس کو میر انیس صاحب نے زیادہ لطیف، اور صاف کر دیا ہے چنانچہ کہتے ہیں ع گویا زبان نکالے ہوئے اژدہا چلا،
میر انیس نے اسی سے دو نیزوں کے باہم ٹکرانے کا مضمون پیدا کیا اور اس لطف کو دوبالا کر دیا ع دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے،

حسن تعلیل | تھا دیدۂ حیران، ہر اک زخم بدن میں | انگشت تاسف تھی زباں سب کے دہن میں
مبالغہ | گھوڑا وہ تیز رو ہے کہ ناگاہ ایک بار | اتنا کہا تھا وہم نے ہاں چل تو ایک بار
دونوں نے ہم عنانی و سرعت کی اختیار | آخر کہاں وہ اور کہاں وہم ہرزہ کار

کچھ کچھ تو ساتھ ساتھ وہ مفدور بھر گیا
پھر یہ خبر نہیں کہ کہاں تھا کدھر گیا

اسی زمانہ میں میر خلیق صاحب نے مرثیہ کے فن کو بہت ترقی دی، میر انیس

صاحب اُن کے بیٹے جا بجا اپنے مرثیوں میں اُنکی فصاحت اور روزمرہ کا ذکر کرتے ہیں ایک بند میں اپنے روزمرہ پر ناز کرتے ہیں، اور کہتے ہیں ع حقا کہ یہ خلیق کی ہے سر بسر زباں، میر خلیق کے ایک سلام کا مطلع و مقطع مشہور ہے ؎

مُجرائی طبع کُند ہے لُطفِ بیاں گیا	دنداں گئے کہ جوہرِ تیغ زباں گیا
گذری بہار عمر، خلیق اب کہینگے سب	باغِ جہاں سے بُلبلِ ہندوستاں گیا

ان اشعار سے قیاس ہوتا ہے کہ میر خلیق نے میر ضمیر سے کچھ کم اس فن پر احسان نہیں کیا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ اُن کا کلام نہیں ملتا، میر نواب صاحب نامی ایک بزرگ نے جو میر خلیق کے بیک واسطہ شاگرد تھے، ۱۲۹۷ھ میں بمقام گلبرگہ حیدرآباد دکن، ایک مجموعہ چھاپا تھا، جسمیں میر خلیق، مونس اور انیس کے چند مرثیے جمع کئے تھے، اس میں میر خلیق کے متعدد مرثیے ہیں لیکن اکثر وہ ہیں، جو آج میر انیس کے نام سے مشہور ہیں اور جو میر انیس کے چھپے ہوئے مرثیوں میں شامل ہیں، بعض ایسے ہیں جو مطبوعہ مرثیوں میں شامل نہیں، لیکن زبان اور طرز ادا سے قیاس ہوتا ہے، کہ میر انیس ہی کے نتائج فکر ہیں، اور اگر وہ واقعی میر خلیق کا کلام ہے تو بیٹے کو باپ پر ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔

چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

رُتا ہے باپ، اے علی اکبرؑ! ابھی نہ جا	دل مانتا نہیں مرے دلبر ابھی نہ جا
اے لال! سوئے نیزہ و خنجر ابھی نہ جا	ہے ہے نہ جا شبیہ پیمبر ابھی نہ جا

مضطر ہوں عین آنے پہ آتا نہیں مجھے
رونے میں مُنہ ترا نظر آتا نہیں مجھے

ماتھے کو چومتے تھے کبھی اور دہن کبھی
تکتے تھے سوئے زلف شکن در شکن کبھی
روتے تھے لیکے بوسۂ سیب ذقن کبھی
یوسف کا اپنے سونگھتے تھے پیرہن کبھی

ملتے تھے خشک ہونٹھ لبِ گلعذار سے
سینہ پہ رکھتے تھے کبھی منہ اپنا پیار سے

فوجوں کا ہجوم

پیاسے پہ مثل ابر امنڈ آئے دل کے دل
شعلے صفت چمکنے لگے برچھیونکے پھل
چلوں میں تیر رکھ کے بڑھے رومی و زنگی
تیغیں اُٹھی ہوئیں جو کھنچیں ہٹ گئی اجل

دن کو سیاہی شب ظلمات ہوگئی
کھوئے نشان شامیوں نے رات ہوگئی

تلوار

موجیں فدا حباب ہیں سر اُس کے سامنے
شق ہیں بہادروں کی جگر اُسکے سامنے
رکھتی ہے کیا بساط سپر اُس کے سامنے
تنکے ہیں جبرئیل کے پر اُس کے سامنے

ماریں کمر کا ہاتھ اگر پاؤں گاڑ کے
دو ٹکڑے آسیا کی طرح ہوں پہاڑ کے

فوجوں کی بدحواسی

حیران تھے کب حسام سے کافی جدا ہوئی
ترکش میں ڈھونڈتے تھے کہ تلوار کیا ہوئی

میر انیس تقریباً ۱۲۱۸ھ میں پیدا ہوئے، اُنہوں نے مرثیہ کو جو ترقی دی، اُسکی تفصیل آگے آئیگی، یہاں جو باتیں کہنے کے قابل ہیں، یہ ہیں۔

۱، میر انیس کا خاندان دلی کا خاندان تھا، اگرچہ اُسکے پردادا میر ضاحک دلی سے چلے آئے تھے، اور فیض آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی، تاہم دہلی کی جو خصوصیتیں تھیں، وہ اخیر تک اس خاندان میں قائم رہیں، میر انیس، اکثر موقوں پر نازک لہجہ میں کہتے تھے، صاحبو، ارباب لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے، یہ میرے گھر کی زبان ہے

اسی بنا پر جا بجا جگہ کو جاگہہ لکھا ہے، اور یہ صرف تحریری زبان نہیں، وہ یوں ہی بولتے بھی تھے؛ میں نے اپنے معزز دوستوں سے جو میر صاحب کی صحبتوں میں، اکثر شریک رہا کئے ہیں، سُنا ہے کہ جب کبھی اُنکی مجلس میں لوگ صف نعال میں آکر بیٹھ جاتے تھے، تو فرماتے تھے، صاحبو! جاگہہ ادہر ہے، افعال کو فاعل کی مطابقت سے جمع لکھنا بھی دہلی ہی کا اثر ہے مثلاً ع جلدی میں گو جوانوں نے چوٹیں بچائیاں

۲ میر صاحب نے شاعری میراث میں پائی تھی، اُن کے جو خاص جوہر ہیں وہ میراث ہی کی یادگار ہیں، اُن کے دادا میر حسن گو غزل بھی کہتے تھے لیکن جس چیز نے اُن کو عالم شہرت کا تاجدار بنایا، وہ ان کی مثنوی بدر منیر ہے،، اس مثنوی کا خاص وصف، واقعات، اور کیفیات کا سین دکھانا ہے وہ جس واقعہ یا حالت کو لکھتے ہیں اسکا سماں باندھ دیتے ہیں۔

میر انیس کے مرثیوں میں واقعات، اور کیفیات کی تصویر کھینچ دینے کی جو خصوصیت ہے، دادا کی میراث ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ میر حسن واقعہ نگاری کی وسعت میں ابتذال، اور عامیانہ بول چال کی پرواہ نہیں کرتے، میر انیس نے واقعہ نگاری اور مصوری کے ساتھ بندش کی چستی، اور خواص کی طرز گفتگو کی خصوصیت بھی قائم رکھی اور یہ قادر الکلامی کی انتہا ہے۔

۳ میر حسن صاحب غزل گوئی میں اگرچہ سودا اور میر درد کے شاگرد تھے، لیکن سودا کا پرتو اُن پر نہیں پڑا صرف میر درد کا رنگ ہے، یعنی روزمرہ صفائی، گھلاوٹ اور درد، یہی باتیں میر انیس صاحب کے ہاں بھی ہیں، جو لوگ کہتے ہیں، کہ میر انیس صرف بین لکھنا جانتے ہیں، اس جھوٹ میں سچ بھی ہے یعنی بین، رثم سے بہتر

لکھتے ہیں، یہ وہی خصوصیت ہے جو دادا سے ترکہ میں ملی ہے،

۴، میر انیس کی شاعری کے متعلق یہ مسئلہ نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے کہ مرزا دبیر کی رقابت اور مقابلہ نے اُن کے کلام پر کیا اثر پیدا کئے، اگر یہ پتہ لگ سکتا کہ دونوں حریفوں میں سے اوّل کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا اور خاص خاص مرثیے بلکہ خاص خاص بند جو دونوں کے ہاں قریب المعنی پائے جاتے ہیں، اوّل کس نے کہے، تو شاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حل ہو جاتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ باوجود بہت سی جد و جہد کے اس بارہ میں مجھ کو کچھ کامیابی نہیں ہوئی،

دونوں حریفوں کے مرثیوں کو دیکھو، تو صاف نظر آتا ہے، کہ ایک نے دوسرے کے کلام کو سامنے رکھ کر لکھا ہے، لیکن زمانہ کے تقدیم و تاخیر کے نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں متعین ہوتا کہ ایجاد کا فخر کس کو ہے، اور کس نے کس سے کیا اخذ کیا ہے، میر انیس جا بجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے حریف اُن کے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، مثلاً ؎

محو و رمز

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار	خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
نواسنجیوں نے تری اے انیس	ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا
ملتی نہیں دزدان معانی سے نجات	سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے

ان چوٹوں کو سُن کر مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے، یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں، میرا حریف سرقہ کرتا ہے بلکہ صرف بتری کرتے ہیں کہ میں اس جرم کا مرتکب نہیں، چنانچہ فرماتے ہیں، ؎

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں	ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں

ہے استفادہ مجھ کو احادیث و سیر سے		یعنی بری ہوں سرقۂ مضمون غیر سے

اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ میر انیس، میرزا صاحب کے مقابلہ کا قصد نہیں کرتے تھے، اور اُن کے مرثیوں کا جواب لکھنا نہیں چاہتے تھے اور میرزا صاحب اس کا اشارہ کرتے، اُس کے ساتھ جب بعض مرثیوں سے صاف ثابت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلہ پر لکھے گئے ہیں، تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے کہ مقابلہ اور ہم طرحی و مسابقت کی کوشش، میرزا صاحب ہی کی طرف سے ہوتی تھی، میر انیس نے اسی کی طرف ایک موقع پر اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل		اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

جن مرثیوں یا شعار یا مضامین میں تقابل یا توارد ہے اُن کی تفصیل آگے آئیگی اور وہاں اس تمہیدی بحث کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

۵، میر انیس کا جو کلام موجود ہے ۵ جلدوں میں شائع ہوا ہے، لیکن میر صاحب کے متوسلین کا خاص دعویٰ ہے، کہ ان مرثیوں میں بہت کچھ تحریف، اور خلط ہوا ہے، مولوی عبد الغفور نساخ نے ایک رسالہ مرزا دبیر اور میر انیس کے اغلاط کے متعلق لکھا تھا، اس کا جواب میرزا محمد رضا متخلص بہ معجز، شاگرد ناسخ نے لکھا جس کا نام تطہیر الاوساخ ہے، اور جو ۱۲۹۶ھ میں شعلۂ طور کان پور میں چھپا تھا، اس کے دیباچہ میں میرزا رضا صاحب لکھتے ہیں،

ثانیاً یہ بات بھی کالنار علی العلم ہے کہ اکثر تلامذۂ میر صاحب و مرزا دبیر صاحب نے بلحاظ اپنے پڑھنے کے اکثر تصرفات بہ تغیر و تبدل الفاظ و مصرعہ و بند کے کئے ہیں، بہ نظر اختصار کسی مرثیے کے کچھ بند نکال ڈالے، اور کہیں درمیان مرثیہ میں کوئی

مطلع یا بند ایجاد کر کے الحاق کیا تا کہ وہیں سے پڑھنا شروع کریں کہیں بغرض بکاو
ابکا مضامین مبکیہ موزون کر کے شامل مرثیہ کیئے کہیں الفاظ میں موافق اپنے فہم وسلیقہ کے
کمی وبیشی کی، یا مشتاقین نے جو مرثیہ جدید زبان سے ان صاحبوں کی مجلس میں
سُنا خفیہ تحریر کیا، اور جو الفاظ یا مصرع بہ سبب عجلت تحریر یا عدم سماعت کے
رہ گئے، اسکی تکمیل بطور خود کی، اس باعث سے کہ نقل مرثیہ جدید و نو تصنیف کا
دستیاب ہونا شاعرین سے غیر ممکن تھا، پس جو کچھ کہ مرثیے اُن کے تلامذہ کے پاس
ہیں، اُن میں اکثر کا اصل نہیں ہیں تغیر و تبدل و اضافہ و نقصان اُن میں بہت
ہے، اور انہیں مرثیوں کی نقل وہ مرثیے ہیں، جو مطبوع ہوئے ہیں پس مراثی
مطبوعہ من قبیل بناء الفاسد علی الفاسد ہیں،

اس بنا پر میرزا رضا صاحب نے میر نفیس صاحب سے جو میر انیس کے
فرزند رشید تھے مطبوعہ مرثیوں کی تصحیح کی جس کا نتیجہ حسب ذیل ہے،

یہ مرثیہ ع اے تیغ زباں جوہر تقریر دکھا دے، اس مصرعہ تک، ملنے لگے،
آنکھیں قدم سرور دین پر، میر صاحب کا کلام ہے، باقی ۱۴۵ سے لیکر ۱۵۵ تک اور
مقطع کے دو اوّل مصرعے سب الحاقی ہیں،

یہ مرثیہ ع دشت دغا میں نور خدا کا ظہور ہے، ستر بند تک یعنی اس شیب
تک مصرع چھاتی کی پار نیزہ کی نوکیں نکل گئیں، میر صاحب کا کلام ہے، باقی الحاقی ہے، یہ شعر

پٹھوں گلے سے میں پدر ناتوان کے	سینہ سے تو سرک تو مرے بابا جان کے

الحاقی ہے،

میرزا رضا صاحب نے اور بہت سے اعتراضات کے جواب میں جو خاص خاص

الفاظ یا تراکیب پر تھے اُن الفاظ اور تراکیب سے انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ اصل مرثیہ میں یوں نہیں، یوں ہے، چونکہ اس قسم کے الفاظ نہایت کثرت سے تھے، اسلئے ہم اُن کو قلم انداز کرتے ہیں۔ ناظرین چاہیں تو اصل رسالہ کو ملاحظہ فرمائیں۔

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ مطبوعہ مرثیے نہایت غلط چھپے ہیں، لیکن میرزا رضا صاحب نے تو یہ غضب کیا ہے کہ جہاں کوئی لفظ محاورۂ حال کیخلاف نظر آیا، اُس کے وجود سے انکار کر دیا، حالانکہ یہ تعمیم صحیح نہیں، میر انیس نے بہتّر برس کی عمر پائی، اُنکی ابتدا مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ نہایت کثرت سے متداول تھے، اور شعرا بے تکلف اُنکو استعمال کرتے تھے۔ شیخ ناسخ نے البتہ اس قسم کے تمام الفاظ کو ترک کر دیا تھا، لیکن جو لوگ اپنے تئیں دلّی کی طرف منسوب کرتے تھے، وہ ان الفاظ اور محاورات کو وطن کی یادگار سمجھتے تھے۔ چنانچہ غالب و ذوق جو خاتم الشعرا ہیں اُن کے ہاں وہ الفاظ بے تکلف ملتے ہیں، جن کو شیخ ناسخ مدتوں سے چھوڑ چکے تھے مثلاً میرزا غالب فرماتے ہیں +

ع ستمگش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں،

حالانکہ اس قسم کی جمع، ایک مدت سے متروک ہے، اس قسم کے الفاظ میر انیس کے ہاں بھی ہیں، اور کثرت سے ہیں، لیکن وہ ابتدائی مشق کی ہیں ورنہ شیخ ناسخ کے اثر، یا خود مذاق کے بدلنے سے، جسقدر زمانہ گذرتا گیا، یہ صاحب قدیم مخصوص الفاظ اور تراکیب چھوڑتے گئے۔

میر انیس کی شاعری کی خصوصیات

اب ہم تفصیل کیساتھ میر صاحب کی شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہیں،

فصاحت۔ علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں اُن میں تنافر نہ ہو، الفاظ نامانوس نہ ہوں، قواعد صرفی کے خلاف نہ ہو" فصاحت

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے، اور چونکہ آوازیں بعض، شیریں، دلآویز، اور لطیف ہوتی ہیں، مثلاً طوطے و بلبل کی آواز اور بعض مکروہ و ناگوار مثلاً کوّے اور گدھے کی آواز، اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض سُستہ، سُبک، شیریں، اور بعض ثقیل بھدّے، ناگوار، پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں، اور دوسرے کو غیر فصیح، بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ نہ ثقیل اور مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں اُن کا استعمال نہیں ہوا ہے یا بہت کم ہوا ہے، اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کئے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں، اُن کو فن بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں، اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز خیال کئے جاتے ہیں،

میر انیس کے کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اُس کے کہ اُنہوں نے اُردو شعرا میں سے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیئے اور سینکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے، ہر قسم اور ہر درجہ کے الفاظ اُن کو استعمال کرنے پڑے، تاہم اُنکے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔ اکثر جگہ عربی، فارسی، کے الفاظ

جو اُردو زبان میں کم مستعمل ہیں، ضرورت سے لانے پڑے ہیں، لیکن اس قسم کے الفاظ جہاں آئے ہیں، فارسی ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں جس سے ان کی غرابت کم ہوگئی ہے ورنہ اگر اردو کی خاص ترکیب میں ان الفاظ کا استعمال کیا جاتا تو بالکل خلاف فصاحت ہوتا مثلاً انگشتری، خاتم، رُمح، بادہ، شتا، حسن، اور اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں، جو بجائے خود فصیح ہیں لیکن ٹھیٹ اُردو میں ان کا استعمال نہیں ہوتا میر ضمیر ایک موقع پر کہتے ہیں ع ذریتِ رسولؐ کی خاطر جلائی نار۔ نار کا لفظ اس موقع پر نہایت نامانوس اور بیگانہ ہے۔ لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبوں کے ساتھ اردو میں مستعمل ہوتا ہے مثلاً نار دوزخ، نار جہنم تو وہ غرابت نہیں رہتی،

فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے، بعض الفاظ فصیح ہیں، بعض فصیح تر، بعض اس سے بھی فصیح تر۔ میر انیس صاحب کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں میر زادبیر اور میرزا انیس کے مضمون اشعار لو، اگر میرزا صاحب کے ہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہونگے تو ان کے مقابلہ میں میر صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہونگے اور اگر میرزا صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہونگے تو میر صاحب کے ہاں فصیح تر ہونگے میرزا دبیر کی تخصیص نہیں تمام مرثیہ گویوں کے مقابلہ میں میر انیس کے کلام کا یہی حال ہے،

ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مراتب کا اندازہ ہو سکیگا

میرزا دبیر ع	کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں
میر انیس ع	سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں

میرزا دبیر	ع	آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو
میر انیس	ع	آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو
میرزا دبیر	ع	رویا میں بھی حسینؑ کو رویا ہی کرتے ہیں
میر انیس	ع	حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے
میرزا دبیر	ع	جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحب مکاں
میر انیس	ع	جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

ابتذال

فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ، آسان، کثیر الاستعمال ہو، اس لئے متبذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے، میرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں متبذل الفاظ آجاتے ہیں، ؎

مثلاً جہاں حضرت شہر بانو نے حضرت عباس کی لاش پر نوحہ کیا ہے، شہر بانو کی زبان سے فرماتے ہیں ع ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور، ایک اور جگہ فرماتے ہیں ع ناڑہ توان کی سالگرہ کا نکال لاؤ،

ابتذال کی صاف اور بین مثال، نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے اگر یہ ممیز ہو تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا،

ابتذال کے معنے عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں وہ متبذل ہیں لیکن صحیح نہیں سینکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا، ابتذال کا معیار مذاق صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں

ق صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل، پست اور سوقیانہ ہے،

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور قسم کی جزئی جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ انکی انتہا درجہ قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی اُنکی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پاتا۔

کلام کی فصاحت یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی، لیکن کلام کی فصاحت ں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ کیب میں آئے اُن کی ساخت ہیئت، نشست، سُبکی اور گرانی کے ساتھ اُس خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی قرآن مجید میں ہے ما کذب الفواد ما رأی فواد اور قلب دونوں ہم معنی الفاظ ہیں، اور دونوں فصیح ہیں لیکن اگر اس آیت میں فواد کے بجائے قلب کا لفظ آئے تو خود یہی لفظ غیر فصیح جائیگا جس کی وجہ یہ ہے کہ گو قلب کا لفظ بجائے خود فصیح ہے۔ لیکن ما قبل ر مابعد کے جو الفاظ ہیں اُن کی آواز کا تناسب، قلب کے لفظ کیلئے نہیں ہے،

میر انیس کا مصرع ہے ع فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور صحرا اور جنگل ہم ہی ہیں اور دونوں فصیح ہیں، میر انیس نے جا بجا ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے ہم معنی ہونیکی حیثیت سے کیا ہے، لیکن اگر اس مصرعہ میں صحرا کے بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائیگا میر صاحب کا ایک شعر ہے ؎

ئر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں	جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرعہ کا مصرعہ پھس پھسا ہو جاتا ہے، شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر برابر درجہ کی فصیح ہیں۔ لیکن میر صاحب کے

اس شعر میں ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا	تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جاوے تو فصاحت خاک میں مل جائیگی، لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے اس مصرعہ میں ع شبنم نے بھ دیئے تھے کٹورے گلاب کے۔

شبنم کے بجائے لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی،

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لئے یہ ضرورت ہے کہ جن الفاظ کے سلسلہ میں وہ ترکیب دیا جائے، اُن آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو ورنہ گویا دو مخالف سُروں کو ترغیب دینا ہوگا، نغمہ اور راگ مفرد آوازہ یا سروں کا نام ہے، ہر سُر بجائے خود دلکش اور دلآویز ہے، لیکن اگر دو مخالف سرو کو باہم ترکیب دے دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائینگے،

راگ کے دلکش اور مؤثر ہونے کا گر یہی ہے کہ جن سروں سے اُسکی ترکیب ہو اُن میں نہایت تناسب و توازن ہو،

الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سُر ہیں اس لئے اُنکی لطافت، او شیرینی اور روانی، اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب گرد و پیش کے الفاظ کے لئے میں اُن کے مناسب ہوں۔

میرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرعہ ہے، ع زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے اس میں جتنے الفاظ ہیں یعنی زیر۔ قدم۔ والدہ۔ فردوس۔ بریں۔ سب بجائے خود فصیح ہیں، لیکن اُن کے باہم ترکیب دینے سے، جو صرصر پیدا ہوا ہے وہ اس ف

تا اور گراں ہے کہ زبان اُسکا تحمل نہیں کر سکتی۔ شاید تم کو یہ خیال ہو کہ مصرعہ کی
ب چونکہ فارسی ہو گئی ہے، اسلئے ثقل پیدا ہو گیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں،
ڑوں شعروں میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں، لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا،
میر انیس صاحب کہتے ہیں ؎

ں ہوں سردار شباب چمن خلد بریں	میں ہوں خالق کی قسم دوش محمدؐ کا مکیں

پہلے مصرعہ میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالی اضافات بھی موجود ہے،
ن یہ بھدا پن اور ثقل نہیں ہے۔

جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب، توازن
وافق پایا جاتا ہے، اُس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں،
پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہے، اور یہی چیز ہے جس کو بندش کی صفائی،
ست کی خوبی، ترکیب کی دلآویزی، برجستگی، سلاست اور روانی سے تعبیر
تے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

ں را کہ خوانی استاد گر نگری بتحقیق	صنعت گر است اما شعر روان ندارد

الفاظ کے توازن و تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے وہ ایک
ں مثال میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ میر انیس حضرت علی اکبر کے
ن دینے کی تعریف ایک موقع پر اس طرح کرتے ہیں ع

تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں	

اسی مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں ع

بلبل چہک رہا تھا ریاض رسولؐ میں	

وہی مضمون ہے وہی الفاظ ہیں، لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں شعروں میں کسقدر فرق پیدا کر دیا ہے۔

میر انیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہے۔ اور ان کا ہر شعر اس وصف کا مصداق ہے، نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں ؎

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں	قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہر منوّر سے ملا دوں	کانٹوں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

یہ ہم ہوئے یہ سنتے ہی عباسؑ خوشخصال	غازی کو شیرِ حق کی طرح آ گیا جلال
قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے یہ بولا علیؑ کا لال	اب یاں سے ہٹ کو کوئی ہٹا دے یہ کیا مجال

حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیٹ، الٹ دیں زمین کو

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر	تھیں موج کی طرح سب ادھر کی صفیں اودھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور	پانی میں تھے نہنگ اُبھرتے نہ تھے مگر

فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

پھہرایا تھا سب پہ رعب علمدارِ نوجواں	تسلیم کو جھکے ہوئے تھی فوج کی نشاں
گوشہ اماں کا ڈھونڈھ رہی تھی ہر اک کماں	ترکش بھی تھے ہراس سے کھولے ہوئے دہاں

تیروں کا بیگماں تھا ارادہ گریز کا

مُنہ کُند ہو گیا تھا ہر اک تیغ تیز کا

آگے چل کر کہتے ہیں ۹

تب شمر نے کہا کہ فصاحت سے کیا حصول
بیعت اُنہیں نہ صلح ہمیں بھی نہیں قبول
غازی پکارا او نجس و مرتد و جہول
لیجو نہ مُنہ سے نام جگر گوشۂ رسولؐ

سمجھا ہے کیا امام عراق و حجاز کو
گُدی سے کھینچ لوں گا زبانِ دراز کو

تو کیا ہے اور کیا ہے ترا وہ امیر شام
کرتے ہیں بادشاہ کہیں بیعت غلام
تو بھی نمکحرام ہے وہ بھی نمک حرام
او بے ادب یزید کجا! اور کجا امام

دوزخ سے دور رہتے ہیں ساکن بہشت کے
کبھی جھکا نہیں آگے کنشت کے

ماتم ادھر تھا جشن میں تھے اہل شر اُدھر
ولہ
بجتے تھے شادیانۂ فتح و ظفر ادھر
انعام بانٹتا تھا ہر اک کو عمر و اُدھر
روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرتؑ اِدھر اُدھر

مثل تھا کہ بس حسینؑ بہت روئے بھائی کو
کوئی جوان ہو اور تو بھیجو لڑائی کو

باقی نہیں کوئی تو وغا کو خود آیئے
حیدر کی ذوالفقار کے جوہر دکھایئے
زخم سنان و خنجر و شمشیر کھایئے
گرمی بڑی ہے آج لہو میں نہایئے

آمادہ ہم تو دیر سے بہر ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اُٹھی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

صابر بڑے ہیں آپ پہ یا شاہ انس و جاں
اک بھائی کے فراق میں یہ نالہ و فغاں

رونے سے جی اُمٹھیں گے نہ عباس نوجواں | حضرت پکارتے ہیں کسے بھائی اب کہاں

ملتا ہے کب جہاں میں بھلا جو گذر گیا
اب فکر اپنی کیجیے وہ شیر مر گیا

اکبر نے کی غضب کی نظر سوئے فوج شام | کانپے یہ غیظ سے کہ اُگلنے لگی حسام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے قبلۂ انام | سنتے ہیں آپ لشکرِ اعدا کے یہ کلام

خون اب تو جوش کھاتا ہی ہنگام جنگ ہے
مولا بس اب تو حوصلۂ صبر تنگ ہے

برچھا اُدھر شقی نے لیا دیکھ بھال کے | اکبر اِدھر سنبھل گئے بھالا سنبھال کے
روکے کسے جواب کسے دے کدھر پھیرے | بجلی کے ساتھ ساتھ کہاں تک سپر پھیرے
سب نشۂ غرور جوانی اُتر گیا | تلوار تھی کہ حلق سے پانی اُتر گیا

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا۔ ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزاء کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بحال خود قائم رہے، مثلاً فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقاتِ فعل، جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں، یہی ترتیب شعر میں بھی قائم رہے، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شعر میں اس ترتیب کا بعینہٖ قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے صرف ایک آدھ شعر یا بہت سے بہت شعر دو شعر میں اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے مثلاً سعدی کے یہ اشعار ؎

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری | کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم | ولیکن مدتے با گل نشستم

جمال ہمنشیں در من اثر کرد	وگرنہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

لیکن چونکہ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہُوا کرتی ہے، اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اگر اصلی ترتیب پوری پوری قائم نہیں رہ سکتی تو بہر حال اُسکے قریب قریب پہنچ جائے جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا، اُسی قدر شعر زیادہ صاف، برجستہ، رواں، اور ڈھلا ہُوا ہوگا اور اردو میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ صفت میر انیس صاحب سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی، نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں ؎

صغریٰ حضرت امام علیہ السلام سے کہتی ہیں ؎

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت	تب کی بھی ہے شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اُٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت	پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت
حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقیں ہے	
اب تو مرے مُنہ کا بھی مزہ تلخ نہیں ہے	

صغریٰ نے کہا آپکی باتوں کی میں قرباں	تم جان بچالو کہ میں لونڈی ہوں پھوپھی جاں
بیٹی ہو علی کی، مری مشکل کرو آساں	جیتی رہی صغریٰ تو نہ بھولیگی یہ احساں
کچھ بات بجز گریہ و زاری نہیں کرتیں	
آماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں	

حضرت زینبؑ، حضرت عباسؑ سے فرماتی ہیں ؎

تم سے بڑی امید ہے زہرا کی جائی کو	بھیّا، تمہیں سے لیگی بہن اپنے بھائی کو

حضرت امام علیہ السلام، یزیدیوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ؎

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو	تیر جو چھوڑے ہیں جو تم نے تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادہ پہ غربت میں جفا کرتے ہو	دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم، بُرا کرتے ہو

	شمع ایمان ہوں اگر سر مرا کٹ جائیگا
	یہ مرقع ابھی اک دم میں اُلٹ جائیگا

قولی امام علیہ السلام کی فوج کی حالت، ابن سعد سے بیان کر رہا ہے ؎

یہ سب غلط سُنا تھا کہ ہے لشکر کثیر	کچھ نوجوان ہیں طفل ہیں کچھ، اور کچھ ہیں پیر
ہیں ان میں سات آٹھ تو لڑکے کئی صغیر	پس جائینگے وہ ٹاپوں سے ہنگام کارزار

	کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائینگے
	ان سے تو نیزے بھی سنبھالے نہ جائیں گے

کیا جانے دل میں سوچے تھے کیا شاہ کربلا	مقتل میں کھینچکر اُنہیں لے آئی ہے قضا
لشکر تو یہ قلیل اور اس فوج سے وغا	عمریں ہیں چھوٹی چھوٹی بھلا وہ لڑینگے کیا

	کچھ آزمودہ کار نہیں کچھ مسن نہیں
	ان کے ابھی تو گھر سے نکلنے کے دن نہیں

اس قسم کے اور ہزاروں اشعار ہیں، آگے مختلف موقعوں پر جو اشعار نقل کئے جائیں گے اُن میں اور دوسری خوبیوں کے ساتھ یہ خصوصیت بھی اکثر نظر آئے گی،

روزمرہ اور محاورہ جو الفاظ اور خاص ترکیبیں اہل زبان کے بول چال

روزمرہ

میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتے ہیں، اُن کو روزمرہ کہتے ہیں، روزمرہ اگرچہ ایک جُداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے، لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک فرد خاص ہے یہ ظاہر ہے کہ عام بول چال میں وہی الفاظ زبان پر آئیں گے جو سادہ صاف اور سہل الادا ہوں، اور اگر اُن میں کچھ ثقل اور گرانی بھی ہو تو دن کی بول چال اور کثرت استعمال سے وہ منجھکر صاف ہو جاتے ہیں ابوالعلا معرّی جو ایک ملحد شاعر تھا اُس نے قرآن مجید کا جواب لکھا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ گو یہ کلام بلیغ ہے لیکن اس میں قرآن مجید کی سی روانی اور صفائی نہیں پائی جاتی، اس ملعون نے کہا ابھی تو نہیں، لیکن جب دو چار سو برس نمازوں میں منجھکر صاف ہو جائیگا تو روانی آجائیگی، غرض روزمرہ کیلئے فصیح ہونا لازم ہے میر انیس کے کلام میں نہایت کثرت سے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال پایا جاتا ہے، اور اس پر اُن کو ناز بھی تھا چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مُرغانِ خوش الحان چمن بولیں کیا
مر جاتے ہیں سُن کے روزمرہ میرا

چونکہ میر انیس کا کوئی کلام روزمرہ سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے ہم نمونہ کے طور پر صرف دو چار مثالیں نقل کرتے ہیں ؎

حشر تک حلق میں یہ ذکر غم انگیز رہا	تو تو بچپن کے غلاموں سے بھی کچھ تیز رہا
تعریف کریں دُور کے تو خورسند نہ ہوتا	اعدا سے کسی بات میں تم بند نہ ہوتا
زینب نے کہا جسمیں رضائے شہ عالی	مالک ہیں وہی میں تو ہوں اک چاہنے والی
صدقے گئے فرزند پھوپھی سوگ نشین ہے	

سمجھیں تو مراحق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے

زندہ نہ محمدؐ ہے نہ اب عون ہے بیٹا	تم بھی جو نہ پوچھو تو مرا کون ہے بیٹا
خادم بدانہ غاشہ گردوں سریر سے	کس جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے
کس کی مجال ہے جو کہے گا یہ کیا کیا	ولہ بی بی نے دی غلام کو رخصت بجا کیا
کہنے تھے راہ میں نہ کہ وار اپنا چل گیا	ولہ افسوس ہے کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال

حسن کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے، کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کئے جائیں۔

لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام ہیں۔ مہیب۔ پُر رعب، سخت، نرم، شیریں، لطیف، اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں بعض نرم، شیریں اور لطیف ہوتے ہیں بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے، بعض سے درد اور غمگینی ظاہر ہوتی ہے اسی بنا پر غزل میں سادہ، شیریں، سہل اور لطیف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، قصیدہ میں زوردار اور شاندار الفاظ کا استعمال پسندیدہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح رزم، بزم، مدح و ذم، فخر، دعا، وعظ و پند، ہر ایک کیلئے جدا جدا الفاظ ہیں، شعرا میں سے جو اس نکتہ سے آشنا ہیں وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ اُن کے کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہے، لیکن جو اس فرق مراتب سے واقف نہیں یا ہیں لیکن ایک خاص رنگ اُن پر اسقدر چڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، اُن کا کلام بجز ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہے، یہی نکتہ ہے کہ سعدی سے رزم، اور فردوسی سے بزم نہیں نبھ سکتی۔

میر انیس صاحب نے رزم، بزم، فخر، ہجو، نوحہ، سب کچھ لکھا ہے لیکن جہاں جس قسم کا موقع ہوتا ہے اُسی قسم کے الفاظ اُن کے قلم سے نکلتے ہیں رزمیہ فخر لکھتے ہیں، تو فرماتے ہیں ؎

طاقت اگر دکھاؤں رسالتمآبؐ کی	رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

جلال اور غیظ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ؎

کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے	نکلا دہاڑتا ہوا ضیغم کچھار سے
کیا جانے کس نے روکدیا ہے دلیر کو	سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہی شیر کو
تھا یہ بھرا ہوا عباس مرا شیر جواں	سینہ مُحر پہ رکھے دیتا تھا نیزہ کی سناں
لرزہ تھا رعب خوف سے ہر اک نابکار کو	رو کے تھا ایک شیر جری دس ہزار کو

دیکھو! ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں جس طرح، اُن کے مفہوم میں غیظ و غضب ہے اسی طرح، الفاظ کی صورت و لہجہ سے بھی ہیبت اور غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔

بحروں کا انتخاب اور حسن قافیہ و ردیف

شعر کی دلآویزی اور دلفریبی کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ ہر مضمون کی مناسب بحریں اختیار کی جائیں فردوسی کی اسی غلطی نے اسکے یوسف زلیخا کو مقبول ہونے سے محروم رکھا۔

شاہ نامہ کی بحر رزم کیلئے مخصوص ہے، فردوسی نے عشقیہ واقعات بھی اسی بحر میں ادا کرنے چاہے اور اس وجہ سے ناکام ناکام رہا۔ میر انیس سے پہلے، مرثیے اکثر بڑی بڑی بحروں میں لکھے جاتے تھے، مثلاً ع

جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے

ع آپ تو جیتے رہے، بابا کا سر کٹوا دیا،

یا نہایت چھوٹی بحروں میں،

ع یہ کس منہ سے کہیئے کہ وہ تشنہ لب ہے،

میر صاحب نے تین چار بحریں خاص کرلیں جن میں چند خصوصیتیں پائی جاتی تھیں،

۱۔ رزم و بزم دونوں کیلئے موزوں تھیں، مثلاً یہ بحر، حشر پر پا تھا کہ تیغ حرز یجاہ چلی،

۲۔ فقروں کی ترکیب اُن میں خواہ مخواہ چست ہو جاتی ہے مثلاً یہ بحر،

ع قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں،

۳۔ کانوں کو خوش معلوم ہوتی ہیں،

قدیم مثنویوں میں ردیف کا بہت کم التزام ہوتا تھا قافیہ ہی قافیہ ہوتے تھے میر صاحب نے ردیف کا گویا التزام کرلیا۔ آجکل جو لوگ انگریزی شاعری کی کورانہ تقلید کرتے ہیں وہ دوسرے سے قافیہ ہی کو بیکار کہتے ہیں ردیف کا کیا ذکر ہے، شاید انگریزی زبان کی ساخت اسی قسم کی ہو جیسا کہ عربی میں ردیف نہایت بدنما معلوم ہوتی ہے، لیکن فارسی اور اُردو میں تو ردیف **نمک** اور سہاگا کا کام دیتی ہے جسطرح راگ میں تال نہ ہو تو بدمزہ ہے یہی حالت اردو شعر کی ہے البتہ ردیف کے التزام کیلئے بہت بڑا قادر الکلام ہونا ضروری ہے، ورنہ ردیف کے التزام کے ساتھ آمد اور بے ساختگی قائم نہیں رہتی، لیکن اگر یہ خوبی ہاتھ سے نہ جانے پائے تو ردیف سے شعر چمک جاتا ہے، ان دونوں شعروں پر غور کرو ؎

ساقیا عید ہے، لا بادہ سے مینا بھر کے	کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینہ بھر کے
چاہنا خلق کو صہبا و صنم سے محروم	ایسی نیت پہ بہشت آپکو، واعظ! ملے

دونوں شعر اپنی اپنی حیثیت سے لاجواب ہیں، لیکن پہلے شعر کو ردیف نے

س قدر چمکا دیا ہے بعض جگہ ردیف کی تکرار نہایت لطف پیدا کر دیتی ہے، میر صاحب
ے ہاں اسکی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں حسن قافیہ و ردیف، و تکرار کی یکجائی
ی چند مثالیں ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں ؎

یں مفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی	ولہ	سینکڑوں خم کئے اور کہیں آئی نہ گئی
یطان عمرو سعد کی گردن پہ چڑھا ہے	ولہ	بھاگو پسر شیر خدا رن پہ چڑھا ہے
ثانہ حاملی ولی کے پسر کا ہاتھ	ولہ	دو ہو کے گر پڑا جسے مارا کمر کا ہاتھ
ل چل یہ تھی کہ باپ نہ ٹھہرا پسر کیساتھ	ولہ	اُس معرکہ میں چھوٹ گئے عمر بھر کیساتھ
ھالوں سے پھول لیگئے پھولوں سے زر لیا	ولہ	اپنا خراج تیغ نے اُن سب سے بھر لیا
ب تھک گئی مگر نہ تھکے تیغ زن کے ہاتھ	ولہ	وہ معرکہ رہا اسی گل پیرہن کے ہاتھ
لم شکار بن گیا کیہاں خدیو کا	ولہ	کافر وہ تھا تو ہاتھ بھی مارا جنیو کا
تم ادہر تھا جشن میں تھے اہل شر ادہر عام بانٹتا تھا ہراک کو عمرو اُدھر	ولہ	بجتے تھے شادیانہ فتح و ظفر ادھر روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرت ادہر اُدھر
چانتے تھے خوب پیمبر میرے جوہر ولے یداللہ نے اکثر مرے جوھر	ولہ	مخفی نہیں جبرئیل امیں پر مرے جوہر کرار نے دیکھے ہیں مکرر میرے جوہر
گیا کیا چمک دکھاتی تھی سرکاٹ کاٹ کے انی وہ خود پہئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے	ولہ	تنتی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
اٹھتے تھے جو پرے سے بڑی بول بول کے حملہ کیا جو تیغ دو دم تول تول کے	ولہ	پہلے اُنہیں کو مار لیا دل رول رول کے ہتھیار سب نے پھینک دیئے کھول کھول کے
شہ کو غضب سے مانگتی تھی ہر کماں اماں	ولہ	مضطر زمیں تھی، مانگتا تھا آسماں اماں

دیتے نہ تھے کسی کو امامِ زماں اماں		ہر صف میں تھا یہ شور کہ مولا، الامان الا

تنسیق الصفات جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن یا ایک قسم کے پے در پے آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہوتا ہے، میر صاحب کے کلام میں اسکی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں ؎

دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اسکی بری تھی		برچھی تھی کٹاری تھی سر وہی تھی چھری تھی
موجود بھی ہر غول میں اور سب سے جدا بھی	ولہ	دم خم بھی لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی
اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی پانی بھی ہوا بھی		امرت بھی ہلاہل بھی مسیحا بھی قضا بھی
کوندے میں یہی معرکہ دن بھر نظر آیا	ولہ	شمر آیا۔ سنان آیا۔ حر آیا۔ عمرو آیا
سمٹا۔ جما۔ اٹھا۔ اِدھر آیا۔ اُدھر گیا	ولہ	چمکا۔ پھرا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا
چلتی تھی عجب رنگ سے شمشیر قضا رنگ	ولہ	ہر ہاتھ میں دکھاتی تھی اعدا کو نیا رنگ
چم خم کا جدا رنگ تھا کس بل کا جدا رنگ		لب سرخ۔ دہن صاف، بدن گول، ہر ارنگ

بلاغت

انیس و دبیر کے موازنہ میں یہ فقرہ ضرب المثل ہو گیا ہے کہ میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہے، اور میرزا صاحب میں بلاغت، لیکن یہ فقرہ جسقدر زیادہ مشہور ہے اُسی قدر غلط بلکہ اُس سے زیادہ غلط اور بے معنی ہے، بلاغت کی جو تعریف تمام کتابوں میں مذکور ہے اور جس سے کسی کو کسی قسم کا اختلاف نہیں، اُس کی رُو سے بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو، اس لئے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماع النقیضین ہے، اگر میرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے تو

ل کے معنی ہیں کہ فصاحت بھی زیادہ ہے، کیونکہ کلام اُسوقت تک بلیغ نہیں
کا جبتک اُس کے تمام الفاظ، مفردات و مرکبات فصیح نہ ہوں، اگر فصاحت میں کسی قسم
کمی ہوگی تو بلاغت میں بھی کمی ہوگی، اسلئے کسی کلام کی نسبت یہ کہنا کہ اس میں
غت زیادہ ہے اور فصاحت کم۔ گویا یہ کہنا ہے کہ فصاحت زیادہ بھی ہو اور کم بھی،
بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ کلام اقتضائے حال
موافق ہو، اور فصیح ہو، مقتضائے حال کے موافق ہونا ایسا جامع لفظ ہے
س بلاغت کی تمام انواع و اسالیب آجاتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ کتب معانی مثلاً
ول، ایضاح، وغیرہ میں بلاغت کی جو تشریح کی ہے اور اُسکے جسقدر انواع
سام قرار دیئے ہیں، وہ نہایت جزئی اور معمولی باتیں ہیں، ان تصریحات کی رو سے
ت اس کا نام ہے، کہ مبتدا اور خبر کہاں مقدم لائے جائیں اور کہاں مؤخر؟ کہاں
خبر ہوں کہاں نکرہ؟ کہاں مذکور ہوں، کہاں محذوف؟ اسناد کہاں حقیقی ہو، کہاں
ری؟ جملہ کہاں خبریہ ہو، کہاں انشائیہ؟ دو فقروں میں کہاں وصل ہو، کہاں فصل؟
م میں کس موقع پر اطناب کیا جائے کس موقع پر اختصار؟ گویا بلاغت کا صرف اسقدر
ہے کہ جب تم کسی مطلب کو کسی خاص جملہ میں ادا کرنا چاہو تو وہ یہ بتادے کہ جملہ کے
کیا ہونے چاہئیں اور اُن اجزا کی ترکیب کیا ہونی چاہیئے۔ لیکن اگر عام طور پر
چھا جائے کہ کس قسم کے مضامین کو کیونکر ادا کرنا چاہیئے، مثلاً مدح۔ ذم۔ فخر،
ہنیت۔ تعریض۔ شوق محبت، ان مضامین سے ہر ایک کے ادا کرنے کے کیا
خاص پیرائے ہیں؟ ہر مضمون کا خاکہ کیونکر قائم کرنا چاہیئے؟ کس قسم کے خیالات
ص مضمون کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں؟ تو موجودہ فن بلاغت اُس کے

متعلق کچھ رہبری نہیں کرسکتا حالانکہ بلاغت کا اصلی تعلق مضامین ہی سے ہے نہ الفاظ سے مثلاً یہ امر کہ ایک واعظ کو کسی بات کے ثابت کرنے کیلئے کسی قسم کے سے کام لینا چاہیئے؟ اور اسی بات کو اگر ایک حکیم ثابت کرنا چاہے تو اس کے استد کا کیا طرز ہوگا؟ اس میں الفاظ کی حیثیت سے بحث نہیں ہوتی بلکہ صرف نوعیت استدلال کا لحاظ ہوتا ہے، یعنی اگر ایک حکیم کے استدلال میں واعظانہ مقدمات پا جائیں تو کہا جائیگا کہ خلاف بلاغت ہے، کیونکہ بلاغت کے معنی مقتضائے حال موافق کلام کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک حکیم کو واعظانہ مقدمات سے استدلال کر اُسکے رُتبہ کے خلاف ہے اِس سے ظاہر ہُوا کہ بلاغت کو الفاظ سے چنداں تعلق نہیں محض مضامین کو ... بلیغ یا غیر بلیغ کہا جاسکتا ہے، بلاغتِ الفاظ درحقیقت بلاغ ابتدائی درجہ ہے، اصلی اور اعلیٰ درجہ کی بلاغت، معانی کی بلاغت ہے۔

میر انیس صاحب کے کلام میں بلاغت الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجہ کی ہے لیک یہ اُنکے کمال کا اصلی معیار نہیں، اُنکے کمال کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا کربلا کے واقعات، جو میر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کا موضوع شاعری جہاں تک تاریخ و روایت سے ثابت ہیں نہایت مختصر ہیں، لیکن مرثیہ گویوں ان میں نہایت وسعت پیدا کی ہے بعض جگہ محض ایک اجمالی واقعہ مذکور تھا اس قدر وسعت دی کہ واقعہ کے تمام جزئیات بیان کر دیئے بعض جگہ رواہ میں اس واقعہ کا نام و نشان بھی نہ تھا لیکن اس لحاظ سے کہ وقت اور حالت اقتضا سے اس واقع کا پیش آنا ضرور تھا، واقعہ کو فرض کرلیا ہے اور پھر اسکو اس پھیلا کر لکھا ہے کہ گویا پورا واقعہ من و عن روایتوں میں مذکور تھا۔

مثلاً یہ واقعہ کہ جب حضرت عباس کو علم ملا تو عون و محمد کو رنج ہوا کہ یہ ہمارا حق تھا وہ اپنی ماں حضرت زینب کے پاس شکایت لیکر گئے، انہوں نے سمجھایا کہ امام علیہ السلام نے جو کچھ کیا بجا کیا" یہ واقعہ نہایت تفصیل سے تمام جزئیات کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ کتب تاریخ میں سرے سے اس کا ذکر نہیں، یا مثلاً حضرت علی اکبر کی پیدائش جنگ کیوقت، حضرت زینب کا آزردہ ہونا اور جانے سے روکنا، یا مثلاً حضرت شہر بانو کا حضرت علی اکبر سے اس بات پر ناراض ہونا کہ امام علیہ السلام کو تنہا چھوڑ کر کیوں چلے آئے، ان تمام واقعات کا تاریخ میں پتہ نہیں، اس قسم کے واقعات کے بیان کرنے میں، بلاغت کا پہلا فرض یہ ہے کہ جو واقعہ فرض کیا جاوے وہ ایسا ہو کہ وقت اور حالت کے لحاظ سے اس کا واقع ہونا یقینی ہونیکے برابر ہو، اس کے ساتھ واقعہ کے جزئیات اور کیفیات جو بیان کئے جائیں وہ بالکل مقتضائے حال کے موافق ہوں، اور اس طرح بیان کئے جائیں کہ واقعہ کی صورت آنکھوں میں پھر جائے۔

اس نکتہ کی حقیقت، ایک مثال سے زیادہ تر واضح ہوگی، مرزا دبیر صاحب نے ایک مرثیہ میں یہ واقعہ باندھا ہے کہ جب حضرت علی اکبر جوان ہوئے تو جا بجا ان کے حسن و جمال کا شہرہ ہوا، یہاں تک کہ بادشاہان وقت نے اپنے اپنے ملک سے مصور بھیجے کہ انکی تصویر کھینچکر لائیں، حلب کا بادشاہ سب سے زیادہ مشتاق ہوا اور جب تصویر اس کے پاس پہنچی تو اس نے فوراً اپنی بیٹی سے حضرت علی اکبر کی نسبت ٹھہرائی اور حضرت امام حسین کے پاس پیغام بھیجا، امام ممدوح نے اپنی بے اطمینانی کی حالت بیان کی اور اخیر میں لکھا ؎

اکبر کا بیاہ خالق اکبر کے ہاتھ ہے	بابا کے ہاتھ ہے نہ یہ مادر کے ہاتھ ہے

لیکن بادشاہ حلب نے باوجود اس کے نسبت ٹھیرا ہی دی اور شادی کے تمام
سامان مہیا کرنے شروع کر دیئے۔ ادھر کربلا کا واقعہ پیش آیا۔ جب بادشاہ کو خبر پہنچی تو
وہ مع اپنے خاندان کے کربلا پہنچا، بادشاہ کی لڑکی نے جو حضرت علی اکبر سے منسوب
تھی اس طرح نوحہ کیا ؎

آئی ہوں گھر سے بال پریشاں کیئے ہوئے
دولھا اٹھو، کھڑی ہے دولھن سر لیئے ہوئے

دولھا! تمہاری بے وطنی پر نثار میں
دولھا! تمہاری بے کفنی پر نثار میں
دولھا! تمہاری خستہ تنی پر نثار میں
دولھا! تمہاری کم سخنی پر نثار میں

مرثیے کا ذکر کرتے ہیں سب شور و شین سے
ہے ہے بیان تمہارے کروں کیا میں سے

خوں سے مطلع نہیں میں سوختہ جگر
ہے ہے میں اپنے گھر سے آئی تمہارے گھ
ننھی چوڑیاں پہنے نہ پائی ہیں نوحہ گر
جو آج ٹھنڈی کرتی ہیں صاحب کی لاش

حسرت ہی عقد کی رہی لونڈی کی باپ کو
ہے ہے بندھا نہ مہر جو بخشوں میں آپ کو

دولھا! میں تنگے سر ہوں مجھے تم رواڑھاؤ
دولھا! کہاں میں بیٹھوں تھکانا مجھے بنا
دولھا! مجھے بھی فاطمہ کی پاس لیتے جاؤ
دولھا! برابر اپنے مری قبر بھی بنا

دولھا مقام شرم ہے در در نہ پھرنے دو
پردہ دولھن کا رکھ لو کھلے سر نہ پھرنے دو

مرزا صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرضی عروس کی زبانی ایک بڑا نوحہ الگ کہہ کر

ثیے کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شامل کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

کس عادل و منصب کی میں دُوں روکے دہائی	ہی ہی مرے نوشاہ
سنتی ہے دُلھن شکل رنڈاپے نے دکھائی	ہی ہی مرے نوشاہ

یہ تمام قصہ بالکل بلاغت اور مقتضائے حال کیخلاف ہے، تمام باتوں سے
طع نظر کرکے، ایک کنواری لڑکی کا بین اور نوحہ کرنا جو خود کہتی ہے کہ میں آپ کے
قدیں نہیں آئی، اور پھر دولھا دولھا پکارتی جاتی ہے کس قدر بے معنی اور لغو ہے
میر انیس نے سینکڑوں ہزاروں مرثیے لکھے ہیں، اور ہر مرثیہ بجائے خود
یک قصہ یا حکایت ہے، لیکن کوئی واقعہ ایسا نہیں لکھا جو اقتضائے حال کے
لاف ہو عون و محمد کی روایت کا سرے سے کہیں پتہ نہ تھا، لیکن جب میر انیس
نے اس کو مرثیہ میں لکھا تو تمام لوگوں کو اس کی واقعیت کا دھوکا ہوا یہاں تک
اب وہ بطور ایک واقعہ مسلمہ کے تمام مرثیہ گویوں کے ہاں مختلف پیرایوں
یان کیا جاتا ہے اسی طرح میر انیس نے جس قدر واقعات لکھے ہیں
اوجود رقت انگیز اور مؤثر ہونیکے واقعیت کے قالب میں اسقدر ڈھلے
وئے ہیں کہ کہیں سے اُن پر حرف گیری نہیں ہو سکتی،

مرثیوں میں جو مضامین، قدر مشترک کے طور پر ہیں وہ یہ ہیں، آمادگی سفر
راہ کی تکلیفات اور صعوبتیں، قیام گاہ کا انتظام، دشمنوں کی روک ٹوک، معرکہ
کی تیاریاں، رزم آرائی، رجز، حریفوں کا قتال و جدال، دشمنوں کی فتح، اہل حرم
کی بیکسی اور بیچارگی، شام کا سفر، قید خانہ، دربار کی حاضری۔

ان میں سے ہر عنوان کے ادا کرنے کیلئے بلاغت کے خاص خاص

طریقے ہیں، مثلاً سفر کی تیاری کے بیان کرنے میں بلاغت کا یہ اقتضا ہے کہ سفر کے وقت، جو جو واقعات اور حالات پیش آتے ہیں، اُنکی تصویر کھینچی جائے، سفر کی آمادگی سواریوں کی تقسیم، زادِ سفر کا انتظام، محملوں اور کجاؤں کی تیاری، مستورات کے پردہ کا انتظام، دوست اور احباب کے وداعی جذبات، بھائی بہنوں اور عزیزوں کی گریہ وزاری، دلدہی اور صبر کے کلمات، یہ تمام باتیں تفصیل سے بیان کیجائیں اور اس طرح کی جائیں کہ آنکھوں کے سامنے بعینہٖ سفر کا نقشہ پھر جاتے۔ میر انیس نے جہاں جہاں سفر کا بیان کیا، ان نکتوں کو ملحوظ رکھا ہے،

دو حریفوں کی باہمی معرکہ آرائی کو اس طرح بیان کرنا چاہئے کہ پہلے دونوں کے سراپا، ڈیل ڈول، اور اسلحہ جنگ سجنے کا نقشہ دکھایا جائے، پھر بتایا جائے کہ دونوں نے فن جنگ نے کیا کیا ہنر دکھائے، حریف نے حریف پر کیونکر حملہ کیا کس طرح وار بچایا، تلوار کے کیا کیا ہاتھ دکھائے، بند کیونکر باندھے، وغیرہ وغیرہ میر انیس کے ہاں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں، بخلاف اسکے مرزا دبیر صاحب آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتے ہیں، لیکن یہ پتہ نہیں لگتا کہ دونوں حریفوں میں سے کسی نے دوسرے پر وار بھی کیا تھا یا نہیں،

غرض ہر واقعہ، اور ہر معاملہ کے بیان کرنے میں بلاغت کا یہ اقتضا ہے کہ اسکی تمام خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ دلوں پر وہی اثر طاری ہو جو خود واقعہ کے پیش آنے سے پڑتا، میر انیس کے کلام میں عموماً یہ وصف پایا جاتا ہے ہم نے اس موقع پر مثالیں، اسلئے قلم انداز کیں کہ آگے چل کر، واقعہ نگاری، اور اظہار جذبات وغیرہ کے عنوانوں میں جو مثالیں آئیں گی وہی بلاغت کے لئے بھی کافی

ہوں گی ۔

بلاغت کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ واقعات کے بیان میں جس درجہ و رتبہ، اور جس سن و سال کے لوگوں کا ذکر آئے، اُسی قسم کے طرزِ خیال، اور طریق ادا کو ملحوظ رکھا جائے، بوڑھے، بچے، جوان، مرد، عورت، کنواری، بیوہ، آقا، غلام، نوکر، چاکر، غرض جسکی زبان سے جو خیال ظاہر کیا جائے اُسکی زبان اور طرزِ خیال کی تمام خصوصیتوں کو قائم رکھا جائے، میر انیس نے تمام مرثیوں میں یہ نکتہ ملحوظ رکھا ہے، مثلاً حضرت امام حسین کے سفر کیوقت، محلہ کی بی بیاں حضرت زینب کو سفر سے روکتی ہیں ؎

ملاحظہ ہمسایوں کی ہمدردی اور اظہار اور اُسکا کیا طرز بیان ہے

سب کہتے ہیں زینب سے کہ اے شاہ کی شیدا
کس طرح کی خط آئے یکایک یہ ہوا کیا

پانی کی کمی، گرمی کے دن، خوف کا رستہ
وہ دھوپ پہاڑوں کی، وہ لو اور وہ صحرا

کیا سوچ کے اس فصل میں شبیر چلے ہیں
بچوں پہ کرو رحم کہ ناروں کے پلے ہیں

ہے چھ مہینہ کے بھی بچہ کا سفر ہے
کچھ تم کو پہاڑوں کی بھی گرمی کی خبر ہے

رت میں جوانوں کے تلف ہو نیکا ڈر ہے
رحم اس پہ ہے لازم کہ یہ بچہ گل تر ہے

اصغر کو جُدا دُکھ ہو، قلق ماں کو سوا ہو
گرمی کے سبب دودھ جو گھٹ جائے تو کیا ہو

ایک اور موقع پر اسی مضمون کو ادا کیا ہے ۔

عورتیں کیونکر صلاح دیتی ہیں

ے کے بلائیں ہی سب کرتی ہیں تقریر
اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر

جاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی تشویر
مسلم کا خط آئے تو کریں کوچ کی تدبیر

للہ ابھی قبر پیمبر کو نہ چھوڑیں

گھر فاطمہ زہرا کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

یا مثلاً جب حضرت امام حسینؑ اپنی چھوٹی صاحبزادی صغریٰ کو سفر میں لیجانے سے انکار کرتے ہیں تو وہ حضرت زینب سے سفارش کراتی ہیں ؎

بچوں کے ادائے مدعا کا طرز

صغریٰ نے کہا آپ کی باتوں کے میں قرباں
تم جان بچالو کہ میں لونڈی ہوں پھوپھی جان

بیٹی ہو علی کی، مری مشکل کرو آسان
جیتی رہی صغرا تو نہ بھولیگی یہ احسان

کچھ بات بجز گریہ و زاری نہیں کرتیں
اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

دوسروں کی محبت کا طعنہ

پیاری ہیں جو دو بیٹیاں وہ جائینگی ہمراہ
کیا اُنس، کہ میں گور کنارے بھی تو ہوں آہ

بابا کو نہ اماں نہ بہنوں کو مری چاہ
سب جیتے رہیں خیر ہمارا ابھی ہے اللہ

بھولے سے نہ اب خاطرِ ناشاد کرینگے
میں قبر میں جب ہونگی تو سب یاد کرینگے

خاص عزیزوں کی شکایت

عاشق مرے شہر میں بھیا کہیں واری
دو دن سے خبر بھی نہیں لی آکے ہماری

قاسم کو غرض کیا جو سنیں گریہ و زاری
میں کون؟ سکینہ ہیں چچا جان کو پیاری

اللہ تو ہے گر کوئی غمخوار نہیں ہے
مٹی مری کچھ قبر کو دشوار نہیں ہے

یا مثلاً حضرت علی اصغر کے پیاس سے جان بلب ہوتے کے وقت انکی ماں کی حالت اس طرح بیان کی ہے ؎

چلاتی تھی بکھرائے ہوئے بالوں کو مادر
دولت مری لٹتی ہے اُجڑتا ہے مرا گھر

فریاد ہے اے لختِ دلِ ساقیِ کوثر
آنکھیں بھی جھپکتے نہیں اب تو علی اصغر

کیا ہو گیا اس صاحب اقبال کو میرے
ہے ہے لیے جاتی ہے اجل لال کو میرے

یا مثلاً حضرت امام حسین کی رخصت کے وقت شہر بانو فرماتی ہیں ؎

کچھ حق ہیں اس کنیز کے فرما کے جایئے
صاحب! کسی جگہ مجھے بٹھلا کے جایئے

یا مثلاً جب حضرت امام حسین کربلا میں پہنچے اور وہاں اُترنے کا ارادہ کیا، تو حضرت زینب اس مقام کی وحشت اور ویرانی سے گھبرا کر فرماتی ہیں ؎

کیوں چلتے چلتے آپ نے یاں روک لی لگام
بھیا ادھر تو آؤ یہ ہے کون سا مقام؟

بستی بھی ہے کوئی کہ یہی ایک نہر ہے
اس دشت پُرخطر میں اُترنا تو قہر ہے

جنگل میں ہے بشر کیلئے سو طرح کا ڈر
اُٹھتے ہیں بار بار بگولے اِدھر اُدھر
(عورتوں کی ضعیف القلبی)
رن کٹ گیا تو ہوئے گی شب کس طرح بسر
لشکر میں غُل رہیگا درندوں کا رات بھر

بچے بھی مارے ہول کے تڑپیں پسینے میں
میرا تو دل ابھی سے اُچھلتا ہے سینے میں

اسی واقعہ کو ایک اور موقع پر لکھا ہے، ؎

بھائی سے اس زمین کی سُنی ہے بہت صفت
ہے وہ امام واقف اسرار شش جہت
جو من میں اُن سے بھی لازم ہے مشورت
صدقے گئی حبیب سے بھی کر لو مصلحت

ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو
بھیا مجھے یہ ڈر ہے کہ رد و بدل نہ ہو

یا مثلاً جب امام حسینؑ نے حضرت عباس کو علم دیا ہے تو حضرت زینبؑ عباسؑ

کو مبارک باد دیتے ہوئے فرماتی ہیں ؎

گھر میں سلامت آئیں گی جب سب برادرام
تب دونگی تم کو تہنیت عہدۂ علم

ہاتھوں کو جوڑتی ہی یہ بھیّنا اسیرِ غم
کیجو صلاح صلح، کہ لشکر ادھر ہے کم

تم سے بڑی امید ہے زہرا کی جائی کو
بھیّا تمہیں سے لیگی بہن اپنے بھائی کو

اسی موقع پر سکینہ مبارک باد کو آتی ہیں، تو ان کے صغر سن کے لحاظ سے ان کی مبارک باد دینے کو کس پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

اتنے میں پاس آکے سکینہ نے یہ کہا
چہرہ کی لوں بلائیں میں صدقے جھکو ذرا

عہدہ علم کا، تم کو مبارک ہو اے چچا
میں نے دعائیں کی ہیں، کہو مجھکو دوگے کیا

میدان کا رُخ کروگے کہ دریا پہ جاؤگے
کیا اب بھی تم پیاس ہماری بجھاؤگے

"جھکو ذرا" کی بلاغت پر لحاظ کرو، اور دعا کے صلہ مانگنے کو دیکھو۔

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:۔

چلاتی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا

بابا سے کہہ دو، اب کہیں خیمہ کریں بپا
ٹھنڈی ہوا میں لیکے چلو، تم پہ میں فدا

سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہو ایں، ہو مری حالت خراب ہے

بچوں کی بول چال سے قطع نظر، یہ دیکھو کہ بچوں کی فطرت کو کس نکتہ سنجی سے ظاہر کیا ہے، بچوں کی مدعا طلبی کا بڑا آلہ طعن اور تعریض ہے، اس کو کس خوبی سے ادا

کیا ہے ع تم تو ہو ہیں ہوا مری حالت خراب ہے،

ایک اور موقع پر جب حضرت عباسؑ لڑنے کیلئے چلے ہیں، اور سب لوگ تن بہ تقدیر ان کو رخصت کر چکے ہیں، تو حضرت سکینہ کو خبر ہوئی ہے، وہ گھبرا کر روکنے کیلئے آتی ہیں، اور بہن کے ناز سے کہتی ہیں۔

خیمہ میں جو اغل کہ چلے حضرت عباسؑ
سب بولے کہ لو اور بھی مسرور ہوئے بی اس

گھبرا کے سکینہ نے کہا تب یہ بعمد پاس
کیا کہتے ہو تم مجھ کو تو جانے نہ دو جیا پاس

منہ شہ سے وہ موڑیں گے نہ آنو گی کبھی میں
عمو، مجھے چھوڑیں گے نہ آنو گی کبھی میں

عباس پکارے یہ اس آواز کے قربان
ہم جاتے ہیں پانی کیلئے آؤ مری جان

دامن سے لپٹ کر یہ لگی کہنے وہ نادان
میں گھر سے تمہیں جانے نہ دونگی کسی عنوان

بابا کا مرے کوئی مددگار نہیں ہے
صدقے گئی، پانی مجھے درکار نہیں ہے

یا مثلاً جب حضرت عباسؑ کے شہید ہونے کی خبر آئی ہے، تو لوگ بدحواس ہو رہے ہیں۔ حضرت عباس کی زوجہ نے یہ خبر نہیں سنی ہے لیکن قرینوں سے ان کو شبہ ہوتا ہے، اس کے بدحواسانہ استفسار کو یوں ادا کیا ہے ؎

کہتی تھی یہ گھبرائی ہوئی زوجۂ عباس
کیوں بی بی ہوا بچے مرے کیا ہو گئے بی اس

بانو کہتے ہیں شاہ شہدا آہ کس سے ہوئی پاس
اے وائے مقدر نہ سکینہ کی بجھی پیاس

کیسی خبر آئی ہے کہ جی کھوتے ہو لوگو
تم سب مرا منہ دیکھ کے کیوں روتے ہو لوگو

اس مصرع میں ع اے جانے حقدر نہ سکینہ کی بھی پیاس، کسقدر ایثار نفس کا خیال ظاہر کیا ہے، یعنی اپنے شوہر کے مرنے کا غم اپنی مصیبت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ سکینہ کیلئے پانی نہ لاسکے اور اُنکی پیاس نہ بجھا سکے۔

یا مثلاً جب حضرت علی اکبر نے ماں سے اجازت لیکر میدان جنگ میں جانیکا ارادہ کیا ہے اور حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ پھوپھی سے بھی تو اجازت لو اس وقت حضرت زینب فرماتی ہیں ؎

زینب نے کہا جسمیں رضائے شہ عالی
میں نے تو کوئی بات نہیں منہ سے نکالی

کیا غم ہے نہ پوچھا مجھے ماں سے تو ضائی
مالک ہیں وہی میں تو ہوں اک چاہنے والی

صدقے کئی فرزند اسپہ پھوپی سوگ نشین ہے
سمجھیں تو مراحق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے

بچپن میں یہ کاہے کو مری چھاتی پہ سوئے
کب جاگی میں تا صبح جو یہ چونک کے روئے

کنکھی نہیں کی اگیسو مشکیں نہیں وھوئے
ان کیلئے کب میں نے پسر ہاتھ سے کھوئے

کیوں روتے ہیں یہ کرتے حضرت کو قلق ہے
حق دار ہیں کاہے کو مرا کون سا حق ہے

حضرت علی اکبر کو، حضرت زینب ہی نے پالا تھا، اور وہ اُن کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں، حضرت علی اکبر بھی، ہر بات میں اُنہی کا منہ دیکھتے رہتے تھے، چونکہ اُن کو معلوم تھا، حضرت زینب میدان جنگ میں جانیکی اجازت بڑی مشکل سے دینگی اس لئے اُنھوں نے پہلے اپنے ماں باپ سے اجازت لی ہے کہ اور لوگ اجازت دیدیں تو حضرت زینب سے درخواست کرنے کیلئے سند ہاتھ آئے، اسلئے میں

حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ پھوپی سے بھی تو اجازت لو، وہ بھری ہوئی بیٹھی تھیں، اُنکی طعن آمیز تقریر کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

یا مثلاً جب یزید کی بیوی ہند نے قید خانہ میں اہل حرم کو دیکھنے کیلئے جانا چاہا ہے، تو لونڈیوں اور پیش خدمتوں کی تقریر کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

سب عورتوں کو لیکے چلی جب وہ حق شناس	کہنے لگیں یہ تب جو کنیزیں تھیں آس پاس
کپڑے یہ ملگجے میں بدل ڈالئے لباس	اُس نے کہا کہ ہے مرے دل پر ہجوم یاس
اک دم میں سوگواروں کو میں دیکھ آتی ہوں	
کیسا لباس کیا کسی شادی میں جاتی ہوں	

جب وہ قید خانہ کے دروازہ پر پہنچی ہے تو ؎

بڑھ کر کسی کنیز نے، تب یہ کیا بیاں	بی بی کوئی اسیروں میں زندہ نہیں یہاں
چلئے محل میں آپ بھلا جائینگی کہاں	قابل نہیں حضور کے جانے کے یہ مکاں
گر غش ہوئی تو آپ میں آیا نہ جائے گا	
ہم سے تو اس خرابہ میں بایا نہ جائیگا	

لونڈیاں، ہند کو قید خانہ میں جانے سے روکنا چاہتی ہیں، اس غرض کے حاصل کرنے کیلئے پہلے تو یہ کہا کہ یہاں کوئی زندہ نہیں، پھر یہ کہ مکان آپ کے جانے کے قابل نہیں، پھر اس میں مبالغہ کا یہ اسلوب کہ آپ کو اختیار ہے لیکن

ع ہم سے تو اس خرابہ میں بایا نہ جائیگا،

اسی مضمون کو ایک اور مرثیہ میں اس طرح باندھا ہے کہ درباتوں نے اس خیال سے کہ قید خانہ میں امام زین العابدین بھی ہیں اور وہ غیر محرم ہیں، اہل حرم کو جانے

مخاطب ہو کر کہا ہے ؎

یا تو بیمار کی آنکھیں اُسے[1] بند کریں	یا ہم آکر کسی حجرہ میں جدا بند کریں

غور کرو لونڈیوں اور پیش خدمتوں کی خوشامدانہ فطرت کا کس طرح اظہار کیا ہے اور درباروں کی تحقیر انہ فرمائش کس قدر دلدوز ہے کہ یا تو زین العابدین کی آنکھیں بند کردو، یا ہم آکر کسی حجرہ میں ان کو بند کردیں۔

یا مثلاً جب حُر نے اپنے بھائی، بیٹے اور غلام سے مشورہ کیا ہے کہ کس کا ساتھ دینا چاہیئے، تو اُنہوں نے یوں جواب دیا ہے ؎

بیٹے نے کہا، شہ کی غلامی ہے سعادت	آنکھوں سے چلیں کہ یہ ہے عین عبادت
بھائی نے کہا کفر ہے حاکم کی اطاعت	کچھ ڈر نہیں، بس آج سے کی ترک رفاقت

مظلوم سے دو روز کی پیاسے سے لڑیں ہم
کیا خوب! محمدؐ کے نواسے سے لڑیں ہم

عبد حُر غازی نے کہا تو کے شمشیر	اگر لاکھ ہو جانیں تو نثار سر شتیر
دنیا میں نہ ہوگا عمر و سعد سا بے پیر	کہیے تو کروں اُسکے مٹا دینے کی تدبیر

حافظ ہے خدا، زور سے تلوار کے چلیئے
اس فوج میں چلیئے تو اُسے مار کے چلیئے

دیکھو بھائی اور بیٹے نے جو کہا اور جو ارادہ کیا، ان کو اجازت طلبی کی ضرورت نہیں بخلاف اُس کے غلام کہتا ہے کہ ع کہیئے تو کروں اسکے مٹا دینے کی تدبیر یہ وہی غلامانہ انداز گفتگو ہے۔ اس سے بڑھکر یہ کہ اس فعل کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا، بلکہ کہتا ہے ع اس فوج میں چلیئے تو اُسے مار کے چلیئے،

[1] قیدی

یا مثلاً جب حضرت عباسؑ، میدانِ جنگ کو جا رہے ہیں تو اُن کی
وجہ، حضرت شہر بانو سے کہتی ہیں ؎

تی ہے رو کے بانو سے عالم سے بار بار	ہم کو نباہ کرتے ہیں عباس نامدار
ے لونڈیوں کے باب میں بی بی کو اختیار	کچھ آپ بولتی نہیں اسوقت؟ میں نثار

کہیئے جو روکنے کی کوئی اِن کے راہ ہو
اب عنقریب ہے کہ مرا گھر تباہ ہو

اسی طرح کہتے کہتے، اخیر میں کہتی ہیں، ع۔ بی بی میں کیا کروں میرے
ے صغیر ہیں دیکھو بیقراری کی معذرت میں کس قدر حسرت بھری ہوئی ہے،
رت عباسؑ نے زوجہ کی یہ حالت دیکھی تو اُن کو روکا ؎

ں دیکھتے ہیں جو زوجہ کا اضطرار	ہوتا ہے نیز غم جگر تا اُواں کے پار
ہیں خود، مگر یہ اشارہ ہے بار بار	شوہر کے غم میں یوں کوئی ہوتا ہے بیقرار

آدابِ سے دلبر زہرا کے سامنے
روتی ہیں لونڈیاں کہیں آقا کے سامنے

یا مثلاً جب حضرت عباسؑ، حضرت امام حسینؑ کے اصرار و امتثال امر کی
دریا سے پلٹ آتے تو حضرت عباس کی شجاعانہ حسرت کو اس طرح ادا کیا ہے

کہتے تھے راہ میں کہ نہ زور اپنا چل گیا
افسوس ہے کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

یا مثلاً حضرت عباس نے جب حضرت امام حسین سے خیمہ نصب کرنیکے
ن دریافت کیا ہے تو ؎

کچھ سوچ کر امام دو عالم نے یہ کہا | زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کر
پیچھے ہٹا یہ سنتے ہی عباس با وفا | جا کر قریب محمل زینب یہ دی

سعادتمند چھوٹا بھائی کس ادب سے بڑی بہن سے خطاب کرتا ہے

حاضر ہے جان نثار امام غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

یا مثلاً حضرت زینب نے حضرت علی اکبر کو حضرت عباس کی بلانے کیلئے بھ
وہ جا کر مؤدبانہ طریقہ سے حضرت عباس سے کہتے ہیں ع چلئے پھوپی نے یاد کیا۔
یا مثلاً جب یہ بحث پیدا ہوئی ہے کہ فوج کا علم کس کو دیا جائے تو حض
عباس کی بیوی اپنے شوہر کا استحقاق اس طرح سے بیان کرتی ہیں

خادم شہ دین کی ہیں تو عباس علی ہیں | اس عہدہ کے لائق جو اگر ہیں تو وہ

"جو اگر" غلط ترکیب ہے لیکن مستورات کی زبان کی بعینہٖ نقل کر دی
بات پیدا کر دی ہے جو صحیح لفظ سے پیدا نہیں ہو سکتی تھی،
اس قسم کی صدہا مثالیں ہیں،
بلاغت کا ایک نازک موقع وہاں پیش آتا ہے جہاں حریف کو محال
کرنا ہوتا ہے، دشمن کو اگر حقیر اور ذلیل ثابت کیا جائے تو اس کے مقابل
کا مرتبہ گھٹ جاتا ہے، اور شان و شوکت دکھائی جائے تو مذہبی خیال
ہوتا ہے ایسے مشکل موقع پر میر صاحب جس طرح ان دونوں مشکلوں سے عہدہ برآ ہو
اور مدح و ذم کو پہلو بہ پہلو رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے

بالا قد، و کلفت، و تنومند، و خیرہ سر | روئیں تن، و سیاہ درون، ا
تا وک پیام مرگ کے، ترکش اجل کا گھر | تینیں ہزار ٹوٹ گئیں ہر

دِل میں بدی، طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

ھ کے اور اُسی قد و قامت کا ایک یل — آنکھیں کبود رنگ سیہ ابروؤں پہ بل
ر و بد شعار و ستمگار و پُر دغل — جنگ آزما بھگائی ہوئے لشکروں کے دل

بھالے لیے، کسے ہوئے کمریں ستیز پر
نازاں وہ حربگر پہ یہ تیغ تیز پر

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

ہ سُن کے غیظ میں اک پہلوان روم — گینی کی چار دانگ میں تھی جس شقی کی دھوم
ب، پُر غرور، دو سیہ قلب، دُخمن و شوم — لنگر سے جسکے ہل گئی ہفتل کی مرز بوم

مرحب تھا کفر و شرک میں طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

یب غیظ سے آنکھیں لہو کی جام — تھرائے سام، خوف سے کاندھے پہ وہ حسام
ی، سیاہ بخت، سیاہ دل، سیاہ فام — کھاتا تھا لاکھ بل جو کوئی لے علی کا نام

کُند اسقر کے قعر کا، پتلا گناہ کا
دشمن تھا خاندان رسالت پناہ کا

ے کرے پہاڑ کو وہ گرز گاؤ سر — پہنے ہوئے زرہ پہ زرہ، بر میں بد گہر
نی سے کسے جنگ پر کمر — مُنہ پھیرے جس سے تیغ وہ فولاد کی سپر

دستانے دونوں دست نعدی پسند پر
پاکھر بھی آہنی تھی شقی کے سمند پر

ایک اور موقع پر ؎

نکلا ادھر سے بہر دغا ایک رو سیاہ	زور آور، و تہمتن، و مغرور، و کینہ خواہ
کاندھے پہ گرز، بر میں زرہ، خشمگیں نگاہ	سر پر مثال قبضۂ تیغ آہنی کلاہ

آمد شقی کی تھی کہ رواں رود نیل تھا
ہیبت میں تھا جو دیو تو ہیکل میں پیل تھا

واقعات کے بیان میں بلاغت کا ایک بڑا ضروری اصول یہ ہے کہ کہیں سلسلۂ بیان ٹوٹنے نہ پائے، جب کوئی واقعہ مختلف اور متعدد واقعات پر مشتمل ہے تو ایک واقعے سے دوسرے واقعے کی طرف منتقل ہوتے ہوئے اکثر بیان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، یا زائد اور بھرتی کے لفظ لانے پڑتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی ایک واقعہ کا دوسرے سے پیوند لگایا ہے، مرزا دبیر صاحب کے کلام میں اسکی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، میر انیس کے اکثر مرثیے، بہت سے متعدد واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان پر الگ الگ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر واقعہ ایک جداگانہ مرثیہ کا موضوع ہے لیکن حسن بیان کا یہ اثر ہے کہ تمام مختلف واقعات ایک مسلسل زنجیر بن جاتے ہیں جسکی تمام کڑیاں آپس میں ملی ہوئی نظر آتی ہیں،

مثلاً حرؑ کا ایک مرثیہ لکھا ہے، اس میں حسب ذیل مضامین بیان کئے ہیں حرؑ کی مدح و صفت، امام علیہ السلام اور اہلبیت کا میدانِ جنگ میں آنا دونوں طرف کی تیاریاں حضرت امام حسین علیہ السلام کا وعظ اور اتمام حجت کی تقریر عمرو سعد کا حر کی طرف مخاطب ہونا اور دونوں کی سوال و جواب حرؑ کا امام حسین کی طرف

ح کرنا حضرت امام حسین علیہ السلام کا بزرگانہ استقبال۔ حرؑ کی عفو خواہی اور
ام حسین علیہ السلام کا عفو و کرم، حرؑ کا جنگ کیلئے اجازت طلب ہونا۔ میدان
ک میں جانا اور شہید ہونا۔ مرنے کے وقت حضرت امام حسینؑ کا حرؑ کے پاس پہنچنا اور
ع کی گفتگو،

یہ مرثیہ بہت بڑا ہے اور ہر واقعہ کو نہایت طول دیکر لکھا ہے۔ اس لئے پورا
اس موقع پر نقل نہیں کیا جا سکتا ہم صرف ان موقعوں کے اشعار نقل
تے ہیں جہاں جہاں ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف انتقال کیا ہے۔
مرثیہ حرؑ کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ تعریف کرتے کرتے لڑائی کا ذکر کرتے ہیں ؎

ف حرؑ میں ہی زباں معترفِ عجز و قصور	آمد آمد کی بہادر کا کروں اب مذکور
ب ہوئی مستعدِ جنگ سپاہ منصور	مہر افلاک امامت نے کیا رن میں ظہور

غل ہوا جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے
اے فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے

ئے سرخ شجاعت سے رخِ آلِ نبی	آئی ٹھنڈی جو ہوا بھول گئی تشنہ لبی
ں میں کڑکا ہوا بجنے لگی باجے عربی	یکہ تازوں نے کیا شورِ مبارز طلبی

اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کار و نکی
برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

یاں تول کے ہر غول سے اسوار بڑھے	نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے خونخوار بڑھے
ڑے ہوئے پلوں میں کماندار بڑھے	بولے شیاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے

اسدِ حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں

منجانب ابو الحسین کاوش و تلطیف کلک مرزا

میں نبی زادہ ہوں سبقت نہ مجھے منظور نہیں

یہ سخن سُن کے مخاطب ہوئے اعدا سے امام
اے سپاہِ عرب و مصر و رے و کوفہ و شام
تم پہ کرتا ہے حسینؑ آخری حجت کو تمام
پسرِ مصحف ناطق ہوں سُنو میرے کلام

سخنِ حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شورباجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

امام حسین کا وعظ نہایت تفصیل سے لکھا ہے اسکے بعد عمرو بن سعد اور
کی تاصّہ گفتگو اور سوال و جواب کا بیان کرنا تھا۔ اُسکے لئے ربط کلام کا یہ طریقہ
حضرت امام حسینؑ کے وعظ سے تمام فوج متاثر ہوئی یہانتک کہ عمرو بن سعد
حُر کی طرف (ایک افسر فوج کی حیثیت سے) دیکھا کہ یہ کیا رنگ ہے، اُسنے
امام بالکل سچ کہتے ہیں اس طرح دونوں میں تکرار اور ردوکد کا سلسلہ شروع ہوا
موقع کے اشعار یہ ہیں ؎

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپا
عمرو سعد نے کی مُڑ کے رُخِ حُر پہ نگا
بولا وہ اشہد باللہ بجا کہتے ہیں شاہ
محسن و منعم و آقا ہے مرا وہ ذی جا

اُنکے احسان کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے
سخنِ حق ہیں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

دونوں میں دیر تک ردوقدح ہوتی رہی۔ اب اس واقعہ کے بیان کرنیکا
آیا کہ حُر نے امام حسینؑ کی طرف رُخ کیا اور اُن سے جاکر مل گیا، اسکو یوں ادا کیا کہ عمرو
سعد حُر سے کہتا ہے کہ خبردار! اگر تو نے اُدھر جانے کا قصد کیا تو پرچہ نویس یزید کو
کر دینگے اور تیری جان پر آفت آجائے گی، حُر جواب دیتا ہے ؎

ں خیر سے بہرکانہ مجھے اے ابلیس	وہی کونین کا مالک ہے وہی ساس رئیس
ا تجھے دیگا ترا حاکم ملعون خسیس	کچھ تردد نہیں کہدی کہ لکھیں پھر پولیس

ہاں سوئے ابن شہنشاہ عرب جاتا ہوں
لے ستمگر ہو بچانا تھا تو اب جاتا ہوں

کے یہ ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار	شرخ آنکھیں ہوئیں بردپہ بل آیا یکبار
ں کے دیکھا طرف فوج امام ابرار	پاؤں رکھنے لگا تن تن کی زمیں پر رہوار

غل ہوا سید والا کا ولی جاتا ہے
لو طرفدار حسین ابن علی جاتا ہے

ا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند	حر کا ہاتھ آتا تو کیسا نہ ملی گرد سمند
ہتے تھے ہاتھ میں وہ لیکے جو دوڑی تھی گمند	یہ فرس تھا کہ چھلاوہ یہ پری تھا کہ پرند

کیا سبک سوئے چمن باد بہاری پہنچی
ہم یہیں رہ گئے واں حر کی سواری پہنچی

حضرت امام حسین نے عباس علمدار کو حر کے استقبال کو بھیجا اس کی ترتیب یوں پیدا کی ہے ؎

ں ہوئے علم امامت سی شہ دین آگاہ	ہنسکے عباس سے فرمایا کہ اے غیرت ماہ
ر لشکر کی طرف ہی رخ حر ذی جاہ	سب سے کہدو کہ نہ روکے کوئی اس شخص کی راہ

جاؤ لینے کو عجب تہ شناس آتا ہے
میرا مہماں، مرا عاشق مرے پاس آتا ہے

اسکے بعد حر کی معذرت خواہی حضرت امام حسین علیہ السلام کا عفو، پھر حر کی طلبی

اون جنگ کو نہایت خوبی اور پُر اثر طریقہ سے ادا کیا ہے پورا مرثیہ پڑھو، اور جہاں جہاں ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ شروع ہوتا ہے، ان پر غور سے نظر ڈالتے جاؤ تو معلوم ہوگا کہ سلسلۂ تقریر کے زور سے مختلف واقعات کو کس خوبصورتی سے ایک کڑی میں کر دیا ہے

بلاغت کی جزئیات بلاغت کی جزئی اسالیب، نہایت مختلف الصورت ہیں اور چونکہ ہر جگہ ایک ہی صورت پیدا ہوتی ہے اسلئے انکی کلیات مشکل سے قائم ہو سکتے ہیں، چند مثالوں سے اسکا اندازہ ہو سکیگا،

مثال جب امام حسین علیہ السلام کے تمام عزیز و اقارب و رفقا شہید ہو چکے ہیں تو اتفاق سے ایک راہرو کا اُدھر گذر ہوا، وہ یہ عبرت انگیز موقع دیکھ کر ٹھہر گیا امام علیہ السلام سے واقعہ کی کیفیت پوچھنی شروع کی، آپ نے اپنی مظلومی اور دشمنوں کی بے رحمی کی داستان سُنائی، لیکن اپنا نام نہ بتایا، وہ آپکی صورت شناس نہ تھا لیکن قرائن سے اُسکو اشتباہ ہوتا تھا کہ آپ خاندان نبوت سے تعلق رکھتے ہیں بالآخر اس نے کہا کہ ع اظہار اسم اقدس و اعلیٰ میں کیا ہے باک، "آپنے جو کچھ اور جس طرح جواب دیا اس کو اسطرح ادا کیا ہے ؎

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں	مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اس شعر میں بلاغت کے جو نکتے ہیں صرف مذاق صحیح اُن کا احاطہ کر سکتا ہے تاہم جس حد تک بیان میں آسکتا ہے ہم بیان کرتے ہیں،

موقع کی حالت یہ ہے کہ حضرت امام حسین اپنا نام اس حیثیت کیساتھ بتائیں جس سے کسی قدر شرف و فضلیت کا اظہار ہو تاکہ پوچھنے والا سمجھ سکے کہ یہ وہی امام حسین ہیں جنکا وہ غائبانہ دلدادہ اور مشتاق ہے، لیکن امام ممدوح کو خاکساری مانع آتی ہے

وہ اُس پر اکتفا کرتے ہیں کہ میں حسین ہوں، لیکن چونکہ مستفسر، قرائن سے اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ محض نام لینے سے بھی غالباً پہچان لیگا، اور اس لئے حسین کہنا بھی گویا اپنے آپکو امام کہنا ہے، اس بنا پر نام لینا بھی ایک طرح پر شرف اور فضیلت کا اظہار ہے، اسلئے خالی نام لیتے ہوئے بھی آپ شرما جاتے ہیں اور شرم سے آپ کی گردن جھک جاتی ہے، اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ ع مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں، لیکن شاعر کو جو کہ امام حسین علیہ السلام کی عظمت کا اثر سے لبریز ہے، گوارا نہیں ہوتا کہ آپکا نام اس سادگی سے لیا جائے اس کے نزدیک امام حسین اگر اپنے آپکو بادشاہ مشرقین کہتے تو یہ کچھ خود ستائی نہ تھی، بلکہ محض ایک واقعہ تھا جس طرح رسول اللہ اپنے آپکو رسول اللہ کہتے تھے اور یہ خود ستائی نہیں خیال کی جاتی تھی، شاعر کے دل میں حسرت ہے کہ کاش امام نے بیان واقعہ ہی کیا ہوتا اس کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے ع یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں۔ تاہم اس سے یہ خیال بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کی عالی ظرفی اور شرافت نفس کا یہی اقتضا تھا کہ وہ خاکساری کو بیان واقعہ پر مقدم رکھتے،

اس موقع پر یہ کہے بغیر رہا نہیں جاتا کہ اسی واقعہ کو مرزا دبیر صاحب نے اس طرح باندھا ہے ع فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں،

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کی جو بحث ہے، اُسکے فیصلہ کیلئے دونوں کے صرف یہ دونوں مصرعے کافی ہیں،

مثال ۲ میدان کربلا میں امام علیہ السلام، یزیدیوں سے پہلے پہنچے تھے اور نہر فرات کے قریب اترے تھے، یزید کی فوج پہنچی تو یہ لوگ فوج نے امام علیہ السلام

کی فوج کو وہاں سے ہٹا دینا چاہا اور کہا، کہ ؎

ہم گھاٹ روکنے کیلئے آئے ہیں ادھر	ہے آج شب کو داخلۂ شمر کی خبر

اُن کی آمادگی اور شرارت دیکھ کر، امام علیہ السّلام کے رفقا برہم ہوئے، اس موقع کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں، ؎

بگڑے ابوثمامہ و سعدِ فلک سریر	تولی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر
جوڑا کماں میں، ابن مظاہر نے ایک تیر	بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر

عالبس کو غیظ لشکرِ بدخو پہ آگیا
غصّہ سے بل ہلال کے ابرو پہ آگیا

اُلٹی جناب قاسمِ ذیشاں نے آستیں	قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبر حسیں
بولے پکڑ کے نیچے زینب کے ماجبیں	شیروں سی کیا ترائی کو لے لینگے اہل کیں

ابوثمامہ، سعد، زہیر قین، اسد، عالبس، حضرت امام حسینؑ کے رفقا میں سے تھے حضرت قاسم بھتیجے، حضرت علی اکبر صاحبزادے اور حضرت زینب کے صاحبزادے آپ کے بھانجے تھے، اس موقعہ پر بلاغت یہ ہے کہ جن لوگوں کو جس قدر امام علیہ السّلام سے قرب تھا، اُسی نسبت سے اُن کی طمانیت و آمادگی جنگ کی حالت دکھائی ہے، ابوثمامہ اور سعد بگڑ کر رہ گئے، اسد نے کہا کہ یہ زجر کے قابل ہیں، عالبس کو غصّہ آگیا، ہلال کے ابرو پر بل پڑ گئے، زہیر قین نے تلوار تول لی، حضرت قاسم نے آستین اُلٹی، حضرت علی اکبر تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کے آگے بڑھے، زینب کے صاحبزادوں نے نیچے سنبھال لئے، اس فرق مراتب کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے،

مثال ۳ جب تمام اعزہ اور احباب شہید ہو چکے، اور صرف علی اکبر کا دم

باقی رہ گیا، تو دشمنوں نے چاہا کہ امام حسین علیہ السّلام اُن کو بھی میدان جنگ میں بھیجیں تاکہ بیٹا باپ کی آنکھوں کے سامنے خاک و خوں میں ملا دیا جائے، اس غرض سے انہوں نے اس طرح امام حسین علیہ السّلام کو مخاطب کیا، ؎

اعدا پکارتے تھے کہ یا شاہ دیں پناہ
باقی ہے اور کوئی کہ بس ہو چکی سپاہ

عباس سا تو اب کوئی ہوگا نہ خیر خواہ
بھیجو کسی کو جلد کہ ہم دیکھتے ہیں راہ

چُنتے دو گل پسر کو شہادت کے باغ سے
کب تک بچائیے گا کلیجہ کو داغ سے

دنیا سے کوچ کر گئے عباس نامدار
اب بے چراغ ہے لحد شیر کردگار

حضرت کا صبر و شکر ہے عالم پہ آشکار
مثل خلیل کیجئے فرزند کو نثار

آہیں نہ بھریئے پیٹ کے سر کو نہ رویئے
جب جانیں ہم کہ کھو کے پسر کو نہ روئیے

بھائی کا داغ اور ہے داغ پسر ہے اور
بازو کا درد اور ہے درد جگر ہے اور

قوّت بدن کی اور ہے نور نظر ہے اور
سینہ کا زخم اور ہے درد کمر ہے اور

گر صبر ہے تو گود کے پالے کو بھیجئے
نیزوں میں اپنے گیسوؤں والے کو بھیجئے

دشوار ہے اگر غم فرزند نوجواں
مرنے کو آپ آیئے اے قبلۂ زمان

مشتاق تیر ہیں نبل خنجر و سنان
جان اپنی دیجئے جو ہے پیاری پسر کی جان

اصغر سے کچھ غرض ہے نہ اکبر سے کام ہے
ہم کو تو آپ کے سیر انور سے کام ہے

ان تمام اشعار میں دشمنوں کی طنز، تعریض، اور لاگ دلاگ علی اکبر کو بھولانے کو کس بلاغت کیساتھ ادا کیا ہے، طنز کا سب سے بڑا نکتہ یہ ہے کہ ہمیں واقعیت کا پہلو موجود ہو، کیونکہ سچا طعنہ نہایت سخت اثر کرتا ہے۔ یہ امر کہ بیٹا بھائی سے زیادہ عزیز ہوتا ہے، ایک بدیہی بات ہے، پھر اس دعوی کو متعدد تمثیلوں سے اور زیادہ قطعی کر دیا ہے، یعنی بازو کے درد جگر کے درد سے کچھ نسبت نہیں، جسم کی طاقت پر آنکھوں کی بصارت کو ترجیح ہے، سینہ کے زخم سے کمر کے درد کو کیا نسبت ہے،

امام حسین علیہ السلام نے حضرت عباس کو حضرت علی اکبر سے پہلے میدان جنگ میں بھیجدیا تھا تو اس وجہ سے بھیجا تھا کہ عباس کسی طرح گوارا نہیں کرتے تھے کہ انکے ہوتے علی اکبر پر آنچ آجائے۔ لیکن دشمن اسکی یہ وجہ بتاتے ہیں کہ بیٹا بھائی سے زیادہ عزیز ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام حسین کی یہ لڑائی دینداری پر مبنی نہیں ہے، ورنہ خدا کی راہ میں بیٹے اور بھائی کی کیا تمیز تھی، بلکہ بیٹے کو خدا کی راہ میں پہلے نثار کرتا تھا جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے کیا تھا، پھر یہ بڑھا دیتے ہیں کہ آپکا صبر و شکر تو مسلم الثبوت ہے، بیٹے کیلئے یہ بیقراری کیوں؟ ان طنزیہ فقروں میں جن الفاظ امام حسین علیہ السلام کو خطاب کیا ہے بالکل تعریف سے بھرے ہوئے ہیں، شاہ دین پناہ۔ قبلۂ زمان۔ سرانور۔ ان سب الفاظ کے یہ معنی کہ آپ اپنے آپ کو ایسا سمجھتے ہیں۔

مثال ۴، واقعۂ کربلا کے بعد جب اہل بیت یزید کے دربار میں آگئے ہیں، تو یزید نے اُن سے اس طرح خطاب کیا ہے، ؎

تخت کے سامنے روتے ہوئے آئے جو اسیر	دیکھکر سید سجاد کو بولا وہ شریر

سرکشی کرکے نہ سر بر ہوئے مجھ سے شبیرؑ
شکر کرتا ہوں کہ خالق نے کیا تم کو حقیر

بیٹھنے کا کہیں دنیا میں سہارا نہ رہا
پنجتن اُٹھ گئے اب زور تمہارا نہ رہا

ہاں کہو آج حمایت کو پیمبر ہیں کہاں
کیا ہوئے ابن علی، حیدر صفدر ہیں کہاں
تیر میں اُنکی بہو آئی ہے شبّر ہیں کہاں
ننگے سر زینب دلگیر ہے سرور ہیں کہاں

فرق خنجر سے ہوا جو وہ پدر کس کا ہے
اک ذرا غور سے دیکھو کہ یہ سر کس کا ہے

ان اشعار میں یزید کے کفر اور ارتداد کو ایسے بلیغ اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے جس سے زیادہ خیال میں نہیں آسکتا، یزید کو تسلیم ہے کہ سید سجاد یعنی امام زین العابدینؑ اور اہل حرم نہال نبوت کے شاخ و برگ ہیں، وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اُن کا جو کچھ زور ہے وہ جناب رسالت پناہ اور آل عبا کے بل پر ہے، باوجود اس کے اس بات پر مسرت ظاہر کرتا ہے کہ ان کا زور نہیں رہا، جس کے یہ معنی کہ اس کو خود رسول اللہ کے دنیا میں نہ رہنے کی خوشی ہے، اس پر بھی اکتفا نہیں کرتا بلکہ صاف صاف کہتا ہے کہ رسول اللہ کہاں ہیں؟ علیؑ کہاں ہیں؟ حسنؑ کہاں ہیں؟ ان سب پر طرّہ یہ کہ ان باتوں پر خدا کے احسان کا ممنون ہے کہ اس نے اہل بیت کو خوار اور حقیر کیا، یہ امر خود خدا کو پسند اور مرغوب تھا۔ اخیر کا مصرع اک ذرا غور سے دیکھو کہ سر کس کا ہے بلاغت کی جان ہے، غور سے دیکھنے کی فرمایش اس لئے ہے کہ امام زین العابدینؑ کے نزدیک حسینؑ اس پایہ کے شخص تھے کہ ان کے سر کا کاٹا جانا اور یزید کے دربار میں حاضر کیا جانا عقل میں نہیں آسکتا، اسلئے کہتا ہے کہ رشک ہو تو ذرا غور

سے دیکھو، ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے،

مثال ۵، ۵

تھرا رہے تھے سُن کے یہ تاکید خاص و عام
چیں بر جبیں قریب گیا حُر نیک نام

دیکھا کیا شقی پہ نہ حُر نے کیا سلام
کافر سے کیا جھکے وہ خدا سی ہو جسکو کام

چیں بر جبیں قریب جو وہ شیر نر گیا
اللہ رے رعب حق کہ سعد ڈر گیا

ڈر کر کہا عمر نے کہ اے حُر بنام فام
رَن میں سوار تیرے رسالے کہیں کدھر

کتنے جواں صفوں میں ہیں کتنے ہیں نہر پر
حُر نے کہا کہ تجھ کو کچھ اسکی نہیں خبر

دنیا میں زور اپنا ہے اور اپنا ہاتھ ہے
میں ہوں کسی طرف نہ کوئی میرے ساتھ ہے

کہنے لگا یہ حُر سے بہ نرمی وہ حیلہ ساز
مدت سے ہے یزید کو تیری وفا پہ ناز

سر بر نہ ہونگے ہم سے کبھی سرور حجاز
اب بعد فتح اور بھی ہوگا تو سرفراز

دیر اس میں کیا جو امر قریب الوقوع ہو
تو مصلحت جو دے تو لڑائی شروع ہو

جو اس میں تیری رائے ہی ہے مجھے پسند
پانی تو تین دن سے ہی پر دیسیوں پہ بند

تھوڑے بہت ہیں یاور سلطان ارجمند
پس جائیں گے اٹھائے سواروں نے جب سمند

لشکر میں یاں چھ لاکھ دلاور جوان ہیں
واں ایک مشت ہے جسمیں بہتر جوان ہیں

آمادہ قتل شاہ پہ ہیں سب جوان و پیر
کٹتا ہے اب سر پسر شاہ قلعہ گیر

کیوں بر چھیاں حسین پہ پہلے چلیں کہ تیر
حُر نے کہا کہ مجھ سے نہ یہ پوچھ اے امیر

انساں کو اختیار ہی خود اپنے کام میں
مجھ کو شریک کرتا ہی فضل امام میں

یہ وہ موقع ہے کہ حُرؔ جو یزید کے رسالہ کا افسر تھا، اس بات پر آمادہ ہو چکا ہی کہ یزید سے لوٹ کر امام علیہ السلام کی فوج میں آجائے، یہ خبر سپہ سالار یعنی ابن سعد کو پہنچی تو وہ حُرؔ کو طلب کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو رام کرکے، اس ارادہ سے روک لے، باوجود اس کے کہ حُرؔ کے ارادہ کی خبر سن چکا ہے اور جب حُرؔ اسکے سامنے گیا تو سلام تک نہ کیا، تاہم ابن سعد اس تجاہل کیساتھ پیش آتا ہی کہ گویا اُس کو اس واقعہ کی مطلق خبر نہیں، بالکل خالی الذہن ہو کر پوچھتا ہے ع رن میں سوار تیرے رسالے کے ہیں کدھر، حُرؔ نہایت بے پروائی اور گستاخی سے جواب دیتا ہی، ابن سعد اس کو بھی نظر انداز کرتا ہی اور اس بھرے پر چڑھاتا ہے کہ یزید کو مدت سے تیری وفاداری پر ناز ہے، اُسکے ساتھ یہ ثابت کرتا ہے کہ امام علیہ السلام کسی طرح اس معرکہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے، پھر کس استمالت سے کہتا ہے کہ ؎

ع تو مصلحت جو دے تو لڑائی شروع ہو۔
ع جو اس میں تیری رائے وہی ہے مجھے پسند۔
ع کیوں برچھیاں حسین پہ پہلے چلیں کہ تیر

گویا کوئی کام حُرؔ کے مشورہ کے بغیر کرنا نہیں چاہتا۔ اسکے ساتھ یہ ثابت کرتا جاتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی فوج نہایت کم ہے۔ کل ایک صف ہے اور اُس میں بھی صرف بہتّر جوان ہیں، امام سے لڑنے کیلئے کہتا ہے لیکن ان کا نام جب لیتا ہی تو کبھی سرور حجاز، کبھی سلطان ارجمند، کبھی شاہ کے لفظ سے خطاب کرتا

ہے یہ بھی استمالت کا ایک پہلو ہے، کیونکہ اگر صاف صاف امام علیہ السلام کی برائی کی جائے تو ڈر ہے کہ ضرر بالکل ہتھے سے اکھڑ جائے،

مثال ۶، ؎

رخصت طلب ہے شاہ سے اکبر سا لالہ فام	شہزادہ مرنے جائے سلامت رہے غلام
للہ روکئے نہ اب اے خواہر امام	وہ امر کیجئے کہ بڑھے جس سے میرا نام

بیس ہوں ساتھ ماں نہیں، سر پر پدر نہیں
میں آپکا غلام تو ہوں کو پسر نہیں

یہ موقع ہے کہ حضرت زینب کے دونوں صاحبزادے شہید ہو چکے ہیں اور حضرات عباس میدان جنگ میں جانا چاہتے ہیں، لیکن حضرت زینب روکتی ہیں حضرت عباس منت اور لجاجت کرتے ہیں کہ للہ نہ روکیئے،

اس کیلئے کسقدر بلیغ پیرایہ اختیار کیا ہے، اوّل تو ان کو خواہر امام سے مخاطب کیا ہے، حالانکہ وہ حضرت عباس کی بھی بہن تھیں، اس سے علاوہ اسکے کہ ان کا احترام مقصود ہے، خفیف سا اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ آپ کو مجھ سے وہ محبت نہیں، جو حقیقی بھائی بہن میں ہوتی ہے، اور چونکہ درحقیقت حضرت زینب اُن کی حقیقی بہن نہ تھیں، یہ تعریض زیادہ کارگر ہوتی ہے، پھر فرماتے ہیں کہ بیس ہوں، نہ باپ سر پر ہے نہ ماں ساتھ ہے، سب سے کارگر یہ فقرہ ہے کہ میں آپکا غلام تو ہوں گو پسر نہیں، یعنی اگر آپکا فرزند ہوتا تو مجھ کو بھی اسی طرح اجازت دیتیں جس طرح اپنے صاحبزادوں کو دی اور انہوں نے شہادت کی دولت حاصل کی،

مثال ۷، ؎

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے	تم ہو سو تمہیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام، مدینہ منورہ سے روانہ ہوتے ہیں، تمام خاندان کو ساتھ لیا ہے، لیکن صغریٰ کو باوجود اس کے کہ آپکی چہیتی بیٹی تھیں بیماری کی وجہ سے ساتھ نہیں لی جاتے، صغریٰ نہایت گریہ وزاری کرتی ہیں اور ایک ایک سے سفارش کراتی ہیں کہ مجھ کو بھی ساتھ لیتے چلئے لیکن کوئی حامی نہیں بھرتا اس وقت علی اصغر سے جو شش ماہہ بچے تھے، خطاب کرکے کہتی ہیں کہ اسوقت میرا اور کوئی مددگار نہیں ہے ایک تم ہو لیکن افسوس کہ تم کو بولنے کی طاقت نہیں، تمام لوگوں سے، مایوس ہوکر ایک بچہ کا سہارا ڈھونڈتا اور پھر یہ خیال کہ وہ بولنے کے قابل نہیں انتہا درجہ کی حسرت اور ناکامی کی تصویر ہے،

مثال ۸، ے

استغاثہ یہ کیا۔ حُرؑ نے جو بادیدۂ نم	جوش میں آگیا اللہ کا دریائے کرم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہِ امم	حُرؑ کو یہ ہاتفِ غیبی نے صدا دی اسدم
شکر کر سبط رسول الثقلینؐ آتے ہیں	
اے برادر تیرے لینے کو حسینؑ آتے ہیں	

اخیر شعر میں امام حسین علیہ السلام کا نام، جس سادگی سے لیا ہے کمال بلاغت ہے اس موقع پر اگر بہت سے اوصاف کے ساتھ اُن کا نام لیا جاتا تو یہ بات حاصل نہ ہوتی جب کوئی شخص کمالات وفضائل میں انتہائے رتبہ تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے نام لینے کیساتھ اُس کے تمام اوصاف اور کمالات خیال میں آجاتے ہیں، اُنکے سادہ نام لینے سے اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے، نظامی نے بھی ایک موقع پر اس اسلوب

کو برتا ہے، دارا نے جب سکندر کو خط لکھا ہے تو سکندر کے دعوئ ہمسری پر نہایت تعجب اور افسوس ظاہر کیا ہے، اس موقع پر کہتا ہے ؎

فلک بین چہ ظلم آشکارا کند	کہ اسکندر آہنگ دارا کند

دارا نے یہ فرض کیا ہے کہ سکندر کی حقارت اور میری جاہ و عزت اسقدر مسلّمہ عام ہے کہ صرف دونوں کا نام لے لینا کافی ہے، چنانچہ کہتا ہے کہ آسمان کا یہ ظلم دیکھو! کہ سکندر، دارا کے مقابلہ کا قصد کرتا ہے، لیکن یہاں اس طرز بیان کا موقع نہ تھا، اس لئے سننے والوں پر کچھ اثر نہیں پڑتا دارا کے زمانہ میں ممکن ہے کہ یہ حالت رہی ہو، لیکن آج سکندر کی عظمت و شان اسقدر مسلم ہے کہ سکندر کے محض نام لینے سے اسکی حقارت کا تصور نہیں ہوتا اسلئے شاعر (نظامی) کو چاہیئے تھا کہ وہ اور واقعات سے پہلے سکندر کی ذلت اور حقارت ثابت کرتا، تب یہ طریقہ بیان مؤثر ہوتا یہی موقع فردوسی کو بھی عرب و عجم کے مقابلہ میں پیش آیا۔

چونکہ فردوسی بلاغت کے تمام اصول سے واقف تھا اُس نے سمجھا کہ گو اُس زمانہ میں عرب کی وہی حالت تھی، لیکن جس زمانہ میں خود فردوسی موجود ہے وہ حالت بدل گئی ہے، یعنی عرب کی عظمت تمام قلوب پر چھائی ہوئی ہے اسلئے محض عرب کے نام لینے سے سامعین کے دل میں عرب کی حقارت اور ذلت کا خیال نہیں آسکتا، اسلئے اُس نے پہلے یہ بیان کیا کہ عرب اونٹ کا دودھ اور گوئی کا گوشت کھایا کرتے تھے اس طرح اُس نے عرب کی قدیم حالت کی تصویر کھینچدی اور چونکہ بیان واقعی تھا، اسلئے اُسکا پورا اثر ہوا ؎

ز شیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائے رسید است کار

کہ تختِ کیان را کنند آرزو	تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اس کے ساتھ عجم کا ذکر، تخت کے ساتھ کیا، اور عجم کا نام لیا تو کیان کے لفظ سے لیا جو خود شوکت و شان پر دلالت کرتا ہے، اب جب دونوں قوموں کی ذلّت اور عظمت کا نقشہ کھینچ چکا تو یہ الفاظ ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو آج بھی سامعین کے دل میں انقلاب زمانہ پر حسرت کا وہی اثر پیدا کرتے ہیں جو اس وقت عجم کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

مثال ۹، حُرؓ نے جب یزید کی فوج سے الگ ہو کر امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا ہے تو دور ہی سے عفوِ تقصیر کیلئے اس طرح فریاد کی ہے ؎

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار	الغیاث اے جگر و جانِ رسولِ مختار
مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کی شمار	عفو کر عفو کر اے چشمۂ فیضِ غفار
پار دریائے خطا سے مری کشتی ہو جائے	
دوزخی بھی ترے صدقے سے بہشتی ہو جائے	
اے مددگار و معین الضعفا آ در کتی	اے خبر گیر گروہ غربا آ در کتی
پاؤں لغزش میں ہیں اور دست خدا آ در کتی	ہاتھ باندھے ہوں میں اے عقدہ کشا آ در کتی
دیجئے محشر کو سندار سے آزادی کی	
آیئے جلد خبر لیجئے فریادی کی	
میرے اعمال میں ہر چند سراسر بدی	ہوں گنہگار خدا ے ازلی و ابدی
آپ ہیں مالکِ سرکار جنابِ احدی	اے خداوندِ جہاں خدبیدی خدبیدی
جو نہ بیدست ہیں تکتے ہیں شہنشاہ کا ہاتھ	

آپکا ہاتھ زمانے میں ہے اللہ کا ہاتھ	

پھر جب جناب امام علیہ السلام نے اس کی تقصیر معاف کردی ہے اور کمال مہربانی سے پیش آئے ہیں تو ؎

حُر پکارا بابی انت وامی یا شاہ	قابل عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ
مجھ سے گمراہ کو اک آن میں پہنچائے یہ راہ	سب ہے صدقہ انہیں قدموں کا خدا ہے آگاہ

ہر ذرہ پہ جو ہو نیّر تاباں ہو جائے
آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے

اس موقع پر میر انیس نے اپنی عادت کے خلاف، متعدد عربی جملے استعمال کیے ہیں جو اردو میں بظاہر غریب اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان جملوں کی وجہ سے اُس وقت کی حالت کی جو تصویر کھینچ جاتی ہے، وہ اور کسی طرح ممکن نہیں دعا، استغاثہ اور فریاد کیلئے عربی جملے ایک خاص اثر رکھتے ہیں، اور اسلئے جاہل سے جاہل آدمی بھی جب دعا مانگتا ہے۔ تو عربی ہی لفظ استعمال کرتا ہے استغاثہ اور فریاد کے وقت بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً الامان الغیاث، چونکہ حُر عربی النسل ہے اسلئے اُسکی زبان سے بعینہٖ وہ الفاظ جو ان موقعوں پر عرب استعمال کرتے ہیں۔ واقعہ کی تصویر کھینچنے کیلئے زیادہ کارگر ہو سکتے ہیں، بابی انت وامی کہ فدا اور قربان ہونے کے موقع پر بولتے ہیں، اور یہ فقرہ ایسا موثر اور دلنشین ہے کہ اردو کا کوئی جملہ وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا تھا،

مثال ۱۰ حضرت عباس کو جب امام حسین علیہ السلام نے فوج کا علم عنایت فرمایا ہے تو حضرت زینب اُن سے فرماتی ہیں ؎

گھر میں سلامت آئینگے جب شاہ امم
تب دو نگی تم کو تہنیت عہدۂ علم

تھوں کو جوڑتی ہے یہ بھینا اسیر غم
کیجو صلاح صلح کہ لشکر ادھر ہے کم

تم سے بڑی امید ہے زہرا کی جائی کو
بھیتا نہیں سے لیگی بہن اپنے بھائی کو

اخیر شعر میں معمولی طرز تکلم یہ تھا کہ تم کو مجھ سے بڑی امید ہے اور میں امام حسینؑ کو تمہیں سے لونگی۔ لیکن حضرت زینب نے اپنے آپ کو زہرا کی جائی کہا اور پھر کہا کہ بہن اپنے بھائی کو تم نہیں سے لیگی۔ اس اسلوب کلام کے بدل دینے سے جو بلاغت پیدا کی وہ خود ظاہر ہے،

مثال ۱۱، ۵

پرسا نہیں شہید کا دینے کو آتے ہیں
کس کس کے داغ آج جگر پر اٹھائے ہیں

پیٹے ہیں، خاک اڑائی ہے آنسو بہائے ہیں
یہ ہم تمہارے لال کے خوں میں نہائے ہیں

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت علی اکبر شہید ہو چکے ہیں اور امام علیہ السلام زنانہ میں تشریف لگتے ہیں اور حضرت زینب سے علی اکبر کی شہادت کا واقع بیان فرماتے ہیں اس موقع پر یہ لفظ "تمہارے لال" ایک خاص اثر پیدا کرتا ہے علی اکبر امام حسینؑ کے صاحبزادے تھے لیکن امام علیہ السلام ان کو حضرت زینب کا لال کہکر خطاب کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم جو خون میں نہائے ہیں، تمہارے لال کا خون ہے انسان کو رنج و غم کی حالت میں جب کوئی نہایت قریبی عزیز ہمدرد اور غمگسار ملجا تا ہے تو جوش محبت میں اس غم کو اپنی ذات کیساتھ نہیں بلکہ اسی شخص کی طرف منسوب کرتا ہے گویا اس سے ایسی ہمدردی کی امید کرتا ہے کہ وہ واقعہ خود اسی شخص پر پیش آیا ہے، یہاں

اس طرزِ بیان نے زیادہ اثر اس وجہ سے پیدا کیا ہے کہ فی الواقع حضرت زینب کو علی اکبر سے نہایت سخت محبت تھی، علی اکبر کو بچپن سے انہی نے پالا تھا اور اُن کو اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں،

مثال ۱۲، جب حضرت عباس نے پانی لانے کیلئے نہر پر جانا چاہا ہے تو حضرت زینب نے خطرہ کے لحاظ سے اُن کو روکنا چاہا۔ امام حسین بھی اُن کا جانا گوارا نہیں کرتے۔ اُسوقت حضرت عباس کی زوجہ حضرت زینب سے کہتی ہیں ؎

کہنے لگی یہ زوجۂ عباس غوش صفات	بی بی بھلا یہ کونسے سوا اس کی ہے بات
مشکیزہ لیکے گر یہ نہ جائیں سوئے فرات	پھر ننھے ننھے بچوں کی ہو کس طرح حیات

ہر وقت کبریا سے طلبگار خیر ہوں
آگے جو کچھ سمجھوں کی رضا میں غیر ہوں

یہ فقرہ "میں تو غیر ہوں" اس موقعہ پر نہایت مؤثر اور بلیغ فقرہ ہے۔ وہ حالانکہ حضرت عباس کی بیوی ہیں لیکن اپنے آپ کو غیر کہتی ہیں۔ یہ اس بات کی تعریض ہے کہ میری بات نہ ماننا گویا مجھ کو غیر سمجھنا ہے)

مثال ۱۳

قیدی ہوں ظلم رسیدہ بھی ہوں نادار بھی ہوں	اس لٹے قافلے کا قافلہ سالار بھی ہوں

یہ وہ واقعہ ہے کہ ہند (یزید کی بیوی) قید خانہ کے دیکھنے کیلئے گئی ہے وہاں امام زین العابدین کو قید میں دیکھکر نام و نسب پوچھا ہے اور امام موصوف نے جواب دیا ہے۔ اس شعر میں قافلے کیساتھ لٹنے کی قید نے نہایت بلاغت پیدا کی ہے حسرت اور رنج کے اظہار کا یہ انتہائی درجہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ایک ظاہری معزز

لقب سے یاد کرتا ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرا لفظ بھی ایسا استعمال کرتا ہے جس سے دو معزز لقب، اور زیادہ ناکامی اور حرمان ثابت کرتا ہے۔ امام زین العابدین نے اپنے آپ کو قافلہ سالار کہا، لیکن یہ بھی کہدیا کہ لٹے قافلہ کا قافلہ سالار ہوں،

مثال ۱۴، ۵

یہ سخن کہہ کے مخاطب ہوئے اعدا سے امام	اے سپاہ عرب و مصر و رے و کوفہ و شام
تم پہ کرتا ہے حسین آخری حجت کو تمام	پسر مصحف ناطق ہوں سنو مجھ سے کلام

سخن حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

تیسرے شعر میں مناسب ہو کے جملہ معترضہ نے نہایت بلاغت پیدا کی ہے چونکہ وعظ اور پند کا موقع ہے اور یزیدیوں سے توقع بھی نہ تھی کہ وہ امام کی کسی بات کو جو تحکم کے لہجہ میں کہی جاتی قبول کرتے۔ اسلئے انہیں کی ہنسی پر رکھا گیا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو باجوں کا شور ذرا موقوف کردو۔

استعارات و تشبیہات یہ چیزیں حسن کلام کا زیور ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم و نثر اور تقریر و تحریر میں جو کچھ جادو گری ہے بہت کچھ انہی کی بدولت ہے، لیکن جس طرح ہر چیز جب تک نیچرل حالت میں رہتی ہے اس کا اصلی حسن قائم رہتا ہے جب تکلف اور تصنع شروع ہوتا ہے تو اثر میں کمی آجاتی ہے، اسی طرح تشبیہ اور استعارہ میں بھی جب بقصد و تکلف، غرابت اور غیر مستعمل ندرت پیدا کیجاتی ہے تو اصلی اثر جاتا رہتا ہے۔

اردو کی شاعری میں جسطرح اور بہت سی بے معنی تکلفات پیدا ہو گئی ہیں جنہوں نے

شاعری کا اصلی جوہر خاک میں ملا دیا ہے، اسی طرح تشبیہات اور استعارات کیجانب بھی بالکل بدل گئی ہے اور لطف یہ کہ آجکل کے اہل سخن بدمذاقی سے، اُسی کو کمال سخن سمجھتے ہیں،

انسان میں فطرتاً یہ بات پیدا کیگئی ہے کہ وہ اشیا کی تصویر سے لطف اُٹھاتا ہے ایک بدصورت حبشی ہمارے سامنے آئے تو ہم کو نفرت ہوگی، لیکن اگر کوئی ہو بہو اسکی تصویر کھینچدے تو ہم کو لطف آئیگا اور جس قدر زیادہ اصل کے مطابق ہوگی اُسی قدر طبیعت پُر لطف اور استعجاب کا زیادہ اثر ہوگا۔ چونکہ تشبیہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے اسلئے طبیعت کا اس سے محظوظ اور متلذذ ہونا ایک فطرتی امر ہے

تشبیہ کی دو قسمیں ہیں، مفرد، مرکب، مفرد جس طرح چہرہ کو پھول سے تشبیہ دی جائے، مرکب جس طرح کہا جائے کہ میدان جنگ میں گرد اُٹھی تو اسمیں تلواریں اس طرح چمکتی تھیں جس طرح شب کو ستارے ٹوٹتے ہیں۔

مفرد تشبیہ میں چنداں جدت نہیں ہوسکتی اوّلاً تو اس وجہ سے کہ مفرد چیزوں کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل ہوسکتا ہے ثانیاً مدت سے شعرا اور اہل قلم اس قسم کی تشبیہ سے کام لے رہے ہیں، اسلئے عالم قدرت میں جو چیزیں تشبیہ کے قابل تھیں اکثر کام میں آچکیں، مثلاً چہرہ کو پھول، آفتاب، مہتاب، آئینہ، سے تشبیہ دے سکتے تھے۔ سو سو دفعہ دے چکے، اب عالم فطرت میں کوئی نئی چیز پیدا ہو تو چہرہ کی تشبیہ میں بھی جدت پیدا ہو،

البتہ مرکب تشبیہ میں ہر وقت جدت پیدا ہوسکتی ہے کیونکہ اوّل تو ترکیب کی ہزاروں صورتیں ہیں، دوسرے یہ کہ چند اشیا کی ترکیب سے جو نئی ہیئت پیدا ہوتی

ہے اُسکی طرف ہر شخص کا خیال نہیں منتقل ہو سکتا،

ایک نکتہ اور سمجھ لینے کے قابل ہے، تشبیہ کی اصلی خوبی یہ ہے کہ مشبہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے اور نیچرل شاعری میں جیساکہ قدمائے عرب کی شاعری تھی، تمام تشبیہیں اسی قسم کی ہوتی تھیں، لیکن ایک مدت سے ایشیائی شاعری، نیچرل حالت سے دور پڑ گئی ہے اسلئے آج اس قسم کی تشبیہات کا ڈھونڈنا بیفائدہ ہے تاہم تشبیہ کی خوبیاں جسقدر میر انیس صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں، اُردو زبان میں اُنکی نظیر نہیں مل سکتی، اُنکی تشبیہات میں جو خصوصیات ہیں اُنکی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) اکثر تشبیہات مرکب ہیں،

(۲) اکثر تشبیہات قریب الفہم اور سریع الانتقال الی الذہن ہیں اور یہی تشبیہ کا بڑا کمال ہے،

(۳) علمائے معانی نے لکھا ہے کہ تشبیہ کی غرض کبھی مشبہ کی رفعت اور حسن، اور کبھی تحقیر اور ذلت اور کبھی رعب و ہیبت ہوتی ہے، یہ باتیں میر انیس کی تشبیہات میں کمال کے درجہ پر پائی جاتی ہیں، مثلاً حضرت عباس پر جب ہر طرف سے برچھیاں چلنے لگی ہیں تو اس حالت کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے	جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

برچھیوں سے زخمی ہونا، شکست اور مغلوبیت کی حالت ہے اسلئے اس کے بیان کرنے سے ذلت کا خیال پیدا ہوتا ہے لیکن اسکی تشبیہ نے حالت بدل دی ہے یا مثلاً جب حضرت عباس کے دونوں ہاتھ تلوار سمیت کٹ کر گر پڑے اور اُنہوں نے

مشک کو دانتوں سے پکڑ لیا تو اس حالت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے، ع

مشکیزہ تھا کہ شیر کے منہ میں شکار تھا

مشکیزہ کا منہ میں لینا ایک بدنما صورت ہے، لیکن اس تشبیہ نے بدنمائی کے بجائے شان پیدا کر دی،

یا مثلاً جب تمام اہل بیت ایک ہی رسن میں قید کئے گئے ہیں تو اس حالت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن	جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

رسی میں باندھا جانا اور وہ بھی ایک ہی رسی میں، بظاہر نہایت ذلت نما حالت تھی لیکن تشبیہ نے بدنمائی کو حسن سے بدل دیا،

یا مثلاً یہ شعر ؎

مقتل میں کیا ہجوم تھا اس نور عین پر	پروانے گر رہے تھے چراغ حسین پر

یا مثلاً [illegible] تشبیہ سے دشمن کی ہیبت اور بدنمائی پیدا کی ہے، ؎

کہتی تھی یہ زرہ بدن بد خصال میں	پکڑا ہے پیل مست کو لو ہے کے جال میں

ع گھوڑے پہ تھا عشق کہ پہاڑی پہ دیو تھا ؎

[illegible] کے نفی کو اڑا کہ خیبر کا بند باب	تنور گرم تھا شکم خانماں خراب
جوش غضب سے سرخ ہوئی چشم نابکار	مثل تنور منہ سے نکلنے لگا بخار

(۱۴) محسوسات سے جو تشبیہ دی جاتی ہے نہایت عمدہ خیال کیجاتی ہے، کیونکہ محسوسات رات دن محسوس ہوتے رہتے ہیں، اسلئے اُن کے ذکر کیساتھ فوراً اُن کی صورت ذہن میں آجاتی ہے اور اسلئے مشبہ کی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی

اس قسم کی تشبیہات میر انیس کے ہاں کثرت سے ہیں مثلاً بھاگڑ اور اضطراب کا بیان، ؎

یوں روع کے طائر تن دشت چھوڑ کے بھاگے | جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

تلوار کی تعریف ؎

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آ کے فوج سے | پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے
کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سنان | غل تھا کہ اژدہے نکالے ہوئے زبان

یا مثلاً دو حریف برچھیوں سے ایک دوسرے پر وار کر رہے ہیں اور برچھیوں کی انیاں باہم ٹکراتی ہیں۔

ع دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

اسی حالت کی ایک اور تشبیہ،

ع شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

تعزیہ خانے میں لوگوں کا سیاہ ماتمی لباس، ؎

مردم سیاہ پوش ہیں سب اور گھر سفید | جیسے بیاض چشم ادھر اور اُدھر سفید

حضرت علی اکبر کا چھوٹا سا نیزہ، دشمن کے بھالے سے ٹکراتا ہے،

غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا،

غیظ اور غضب کی حالت، ؎

یوں غیظ تھا عمرو کی طلب سے دلیر کو | جس طرح ٹوک دے کوئی غصہ میں شیر کو

ڈھال پر تلوار کو آسانی سے روک لینا، ؎

یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ ہجوم کو | جس طرح روک لے کوئی شہزور پھول کو

خزاں کے موسم میں پتوں کی حالت،

ع پتے برنگ چہرہ مدقوق زرد تھے

(۵) بعض جگہ تشبیہ سے مبالغہ مقصود ہوتا ہے، اس قسم کی تشبیہیں میر صاحب کے ہاں نہایت اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی ہیں، اگرچہ فی الحقیقت اُن سے تشبیہ کی اصلی غرض نہیں حاصل ہوتی کیونکہ مبالغہ خود ایسی چیز ہے جو اصلیت سے دُور کر دیتی ہے۔

گرمی کی شدّت کا بیان، ؎

گرداب پر تھا شعلہ جوالہ کا گمان	انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زبان	تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جان

پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو بیخ موج تک آئی کباب تھی

اب ہم چند اشعار ہر قسم کی تشبیہ کے ایک جا نقل کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ میر صاحب نے تشبیہ میں کیا کیا لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کی ہیں ؎

کہنی سے دونوں ہاتھ جدا تن سے سر جُدا	ہر نخل قند کی شاخ بُریدا اور ثمر جُدا
ہر سنگ ریزہ نور سے پُر خوش آب تھا	لہریں جو تھیں کرن، تو بھنور آفتاب تھا

ع ہم لوگ زمانہ میں حباب لب جو ہیں

ہلنے لگے درخت لرزنے لگے جبال	سبزہ تھا کمر سے تھی بدن پر زمیں کے بال

ع چلنے میں نیزے کانپتے تھے شل پائے پیر ؎

یہ غیظ تھا عمرو کی طلب سے دلیر کو	جس طرح ٹوک دے کوئی غصہ میں شیر کو
سرعت میں تھا ہرن تو دغا میں ہزبر تھا	پستی میں سیل تھا تو بلندی میں ابر تھا
پھولوں کی سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے	تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے

گھوڑے کی تعریف

اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی	برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

ع لہراتی ہے کبانہر مثال شکم مار
ع افلاک ہنڈولے کی طرح تجھے نہ دوبالا ۵

یارب ترا نام پاک جپنے کے لئے	گویا اک ہڈیوں کی مالا ہوں میں
اڑ کر گری زمین پہ سنان اس کمان سے	گرتا ہے جیسے تیر شہاب آسمان سے
گر میان تھی، تو تیغ دم امتحاں نہ تھی	یہ طرفہ بات تھی کہ دہن تھا زبان نہ تھی
یوں جلوہ گر زرہ میں تن سرخ فام تھا	گویا بچھا ہوا چمنستاں میں دام تھا
چپ ہوں مگر زبان ہے وہی اپنے کام میں	گویا ذوالفقار علی ہے نیام میں
ناخن نے دکھایا جو رخ جلوہ گر اپنا	شرما کے منہ نے جھکایا ہے سر اپنا

پلکوں اور ع رہوار کیا، ہوا پہ سلیمان کا تخت تھا
پنکھوں کی تشبیہ ع بیٹھا ہے شیر پنجہ کو ٹیکے نرائی میں ۵

کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سنان	گل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زبان

ع ذرے نہ تھے زمین پہ سونے کے پھول تھے

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا	تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

ع کھلتی تھیں اور حیا سے نہ آنکھیں جھپکتی تھیں

مل کر کبھی بڑھا کبھی پیچھے سرک گیا	شعلہ تھا آگ کا کہ بچہ اودھر ٹرک گیا

ع اعدا کا لہو تیغ کی باچھوں میں بھر گیا

تلواریں منہ چھپائے تھیں سایہ میں ڈھال کے	خنجر بھی رہ گئے تھے زبانیں نکال کے
مل ہوا جنگ کو اللہ کے پیارے لگنے	اے فلک دیکھ زمین پر بھی ستارے نکلے

سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا	ولہ	دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا	
آیا گیا فرس جو سمٹ کر ادھر ادھر	،،	ڈھالوں کا ابر رہ گیا پھٹکر اِدھر اُدھر	گھوڑا
حملہ غضب ہی بازوئے شاہ حجاز کا		لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا	
ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب		اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب	
کڑیوں سے یوں زرہ کی نکل جاتی تھی شتاب		جسطرح دام سے نکل آتی ہے موج آب	تلوار
سرکش تھے باد کبر سے جو خانماں خراب		خود ان کے گر کے ٹوٹ گئے صورت حباب	
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب	ولہ	خیمے جو تھے جلالوں کے تپتے تھے سب کے سب	گرمی کی شدت
ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر	،،	منہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن ادھر اُدھر	تلوار کی ہیبت
بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سیر		تھے تہ نشین نہنگ مگر آب تھے جگر	

دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

ع ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو بلا جل خاموش ۵

تیغوں کی کچھ خبر تھی نہ ڈھالوں کا ہوش تھا	نیزہ ہر اک سوار کو اک بارد وش تھا
خاک اڑتی تھی منہ پر حرم شیر خدا کے	تھا چیں جبیں فرش بھی جھونکوں سے تو

صنائع و بدائع | اگرچہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض صنائع ایسے بھی ہیں کہ اگر بے تکلفی سے آجائیں تو کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن عام حالت یہ ہے کہ اکثر صنائع و بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچہ زوال ہیں۔

میر انیس جس زمانے میں تھے، شاعری کا مدار صنائع و بدائع پر رہ گیا تھا مبالغہ، ایہام، اور مناسبت لفظی یہی چیزیں شاعری کا کمال خیال کیجاتی تھیں، میر انیس

انہیں لوگوں میں رہنا سہنا تھا، اُنہی سے داد سخن لینی تھی، اور سچ تو یہ ہے کہ انہی کی قدردانی پر معاش اور ضروریات زندگی کا انحصار تھا، ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ وہ زمانہ کی حکومت سے آزاد رہتے، وہ جانتے تھے کہ جس شاعری کو وہ زندہ کرنا چاہتے ہیں صنائع و بدائع اُسکے چہرہ کے داغ ہیں، لیکن اُنہوں نے مجبوراً اس کو گوارا کیا، یہ صرف قیاس نہیں بلکہ مستند اور صحیح روایت سے ثابت ہے، میر کے ایک معزز دوست نے خود میر انیس سے پوچھا کہ آپ لفظی رعائتوں اور صنائع و بدائع کو پسند کرتے ہیں اُنہوں نے جواب دیا کہ "نہیں" لیکن آخر لکھنؤ میں رہنا ہے، تاہم میر انیس نے یہ کہا کہ جو صنعتیں محض لغو تھیں مثلاً صنعت اہمال اور لزوم مالایلزم وغیرہ وہ نہایت کم برتیں اور جسقدر برتیں اُن سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ اس جولانگاہ میں بھی وہ حریفوں سے پیچھے نہیں، باقی صنعتوں کو اُنہوں نے اس طرح برتا کہ کلام کی اصلی خوبی یعنی برجستگی صفائی اور سادگی میں فرق نہ آنے پائے۔ ہم ان تمام صنعتوں کی کچھ کچھ مثالیں نقل کرتے ہیں جو میر صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں،

ایہام، کے یہ معنی ہیں کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں، ایک معنی مراد ہوں، اور دوسرے معنی مراد نہ ہوں، لیکن مقدم اور مؤخر الفاظ سے اُسکو مناسبت ہو مثلاً ع اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں، رنگ کے دو معنی ہیں، ایک تو وہی معمولی رنگ، دوسرے طرح قسم طرز۔ یہاں یہی پچھلے معنی مراد ہیں یعنی پھول کے مضمون کو میں سو طرح سے باندھ سکتا ہوں، یہاں پہلے معنی مراد نہیں، لیکن گل سے اسکو مناسبت ہے یہ صنعت اگر بیساختگی اور بے تکلفی سے برتی جائے تو کلام میں نہایت حسن پیدا ہو جاتا ہے، قدما میں یہ صنعت بالکل متروک تھی، سلمان ساؤجی نے

اسکی ابتدا کی اور اس میں نہایت غلو کیا تاہم اکثر جگہ نہایت بے تکلفی سے بھی استعمال کیا ہے
سلمان کے بعد خواجہ حافظ کے کلام میں کہیں کہیں اسکا پتہ لگتا ہے، لیکن پھر
کسی نے اسکی طرف توجہ نہیں کی، اردو میں ابتدا ہی سے اُسکی طرف میلان رہا، میر انیس
کے زمانہ تک اسکو رواج عام ہو چکا تھا، اور یہ صنعت مضمون بندی کی ایک بڑی عمدہ
صنعت خیال کی جاتی تھی، میر انیس صاحب نے بھی عوام پسندی کی بنا پر یہ صنعت
نہایت کثرت سے برتی ہے، لیکن اکثر جگہ نہایت بے تکلفی سے ادا ہوئی ہے چند
مثالیں ذیل میں درج ہیں ؎

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو نہ جائے	اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے
ہر چند کہ ہوں خسروِ اقلیم سخن	پر غیر دوات کچھ قلمرو میں نہیں
تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں	قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
کیا خوف اُن کو نہر پہ گر روک ٹوک ہے	نیزہ نہیں جو پاس تو اسمیں بھی نوک ہے
بہت توڑ دیئے ہیں جو سوئے دیر گئی ہوں	خندق کو تو دو ہاتھ میں میں پھیر گئی ہوں

تلوار کی زبان سے

ع چلاتی تھیں یہاں کہ خدا جان بچائے (جان جن کو بھی کہتے ہیں)
ع دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے (دم خون کو بھی کہتے ہیں)
ع سب فوج کی تیغیں تھیں اور اک شاہ کا دم تھا (دم تلوار کی باڑھ کو بھی کہتے ہیں) ؎

ڈھالوں کا دور برچھیوں کا اوج ہو گیا	ہنگام ظہر خاتمۂ فوج ہو گیا
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح	ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح
کم نہ کچھ مرتبہ آل عبا سے ہوگا	ولہ عاصیوں کا اسی پردہ میں بھلا ہوگا

ع اک، ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا،

ع غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی،
ع سر دھڑ سے گر پڑا تو جسد کو خبر ہوئی،
ع ایسا گنہ کیا ہے کہ کچھ جسکی حد نہیں (حد گناہ کی سزا کو بھی کہتے ہیں)
ع دریا کا لہو پیر گئی چار ہاتھ میں، ۵

پیدل میں تھی نہ جان، نہ دم تھا سوار میں		ٹوٹی ہوئی صفیں تھیں پھلا کس قطار میں
ایسا کوئی طفلی میں نمودار نہ ہوگا	ولہ	ہاتھ ایسا تو جعفر کا بھی نیار نہ ہوگا
اللہ رے سخن کی تیرے تاثیر انیس	"	رو دیتے ہیں مثل شمع جلنے والے
آکر بزم عزائے شہ میں رونا		ہر آنکھ پہ فرض عین ہو جاتا ہے

ع حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے (عربی میں رویا کے معنی خواب کے ہیں)
ع چپڑ ہیں مگر زبان ہے وہی اپنے کام میں (کام فارسی میں تالو کو کہتے ہیں)
ع آب بقا بھی ہو تو مرے کام کا نہیں،

مبالغہ، قدما کے نزدیک مبالغہ اس حد تک ممدوح تھا کہ کسی وصف کو ایک لطیف پیرایہ میں معمولی حالت سے کچھ بڑھکر بیان کیا جائے، لیکن جب حد سے بڑھا تو عیب اور نقص ہو گیا، فن بلاغت کے امام، ابن قدامہ نے نقد الشعر میں اسکی مثال میں ابو نواس کا یہ مصرعہ نقل کیا ہے۔

یا امین اللہ عش ابدا	اے خدا کے امین! تو ہمیشہ زندہ رہ۔

امام موصوف نے لکھا ہے کہ کسی شخص کا ہمیشہ زندہ رہنا ناممکن ہے اسلئے یہ مبالغہ معیوب اور قبیح ہے، شعرائے عرب، اس قسم کا مبالغہ کرنا چاہتے تھے تو پہلے امکان کی شرط لگا دیتے تھے، یعنی اگر یہ ممکن ہوتا تو یوں ہوتا، ابو تمام کہتا ہے ۵

ولو ان مشتاقا تکلف فوق ما	فی وسعہ لمشی الیک المنبر

یعنی اگر کوئی مشتاق اپنی طاقت سے بڑھکر کام کرسکتا تھا، تو منبر خود تیرے پاس چلا آتا، لیکن عرب میں بھی جب تکلف اور تصنع زیادہ بڑھا اور صحیح مذاق مفقود ہوگیا تو مبالغہ کی یہی خوبی رہ گئی کہ مستبعد، اور ناممکن ہو، اور جسقدر زیادہ ناممکن ہو، اُسی قدر زیادہ اسکا کمال ہی اب یہ حالت پہنچگئی کہ سودا گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

روبرو سے اگر آئینہ کے اس گلگوں کو اق	پھینکدے یکبگی کبھی شرق سی تو غرب تلک
اتنے عرصہ میں پھر آئے تو اسے باور کر	عکس بھی آئینہ سی ہونے نہ پائے منفک

میر انیس کے زمانہ میں، مبالغہ کمال کی حد کو پہنچ چکا تھا اور یہ حالت ہوگئی تھی کہ جبتک مبالغہ میں انتہا درجہ کا استبعاد نہیں ہوتا تھا، سامعین کو مزا نہیں آتا تھا مجبوراً میر صاحب نے بھی وہی روش اختیار کی لیکن چونکہ ان کی اصل فطرت میں سلامت روی اور اعتدال تھا، اسلئے اس میدان میں وہ اپنے حریف مرزا دبیر سے بہت پیچھے رہ گئے اور یہی بات ہی جس کی بنا پر اُن کے حریف کہتے ہیں کہ وہ خیال بندی اور مضمون آفرینی میں مرزا دبیر کا مقابلہ نہیں کرسکتے،

بہرحال اُنکے مبالغہ کا نمونہ یہ ہی، گرمی کی شدت کے بیان میں لکھتے ہیں ؎

وہ لوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب	کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب	جسمے جو تھے جبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
سُرخی اُڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے	
سایہ کنوئیں میں اُترا تھا پانی کی چاہ سے	
آب رواں سے مُنہ نہ اُٹھاتے تھے جانور	جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ہرا دھر

مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خشخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تپ کی تاب
چھپنے کو برق چاہتی تھی دامن سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافور صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب

بھڑکی تھی آگ گنبد چرخ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

شیر اٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گمان
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشان
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زبان
تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جان

پانی تھا آگ گرمیٔ روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

اس کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر
ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پر
گل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو
بجلی ہے جس طرف دم پیکار پھیر لو
کاوے میں شکل گنبد دوار پھیر لو
نقطہ کی گرد صورت پرکار پھیر لو

دوڑے بر دئے آب تو پتلی بھی تر نہ ہو

	آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

حسن التعلیل، یہ ایک لطیف صنعت ہی، اسکی حقیقت یہ ہی کہ شاعر ایک ایسی چیز کو کسی چیز کی علت فرض کرتا ہے، جو درحقیقت اسکی علت نہیں مثلاً ؎

بھلائی جو کرے دنیا میں ہووے وہ پامال	بسان جادہ کسی کو تو راہ مت بتلا

جادہ یعنی راستہ پامال ہوتا ہے، شاعر اسکی یہ وجہ قرار دیتا ہی کہ راستہ لوگوں سے بھلائی کرتا ہی اس لئے پامال ہے، یہ ایک قسم کی تخئیل ہے اور اس لحاظ سے یہ صنعت عین شاعری ہے، کیونکہ شاعری درحقیقت تخئیل کا نام ہی، اس صنعت میں اسوقت زیادہ لطافت پیدا ہوجاتی ہے جب وہ وصف بھی جسکی علت بیان کرتی ہی تخئیل پر مبنی ہو مثلاً میر انیس کا یہ شعر، ؎

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب	اور آب میں سروں کو چھپانے لگی حباب

گرمی کی شدت

موجوں کو اضطراب، اور حباب کا پانی میں سر چھپانے کی علت، ڈر اور خوف کو قرار دیا ہے لیکن موج کا اضطراب، اور حباب کا پانی میں سر چھپانا، خود کوئی واقعی چیز نہیں بلکہ شاعر نے موج کی حرکت کو اضطراب قرار دیا ہے اور حباب جو ٹوٹ جاتا ہی تو اسکو فرض کیا ہی کہ اس نے پانی میں منہ چھپالیا، اس صنعت کو میر انیس نے اکثر جگہ نہایت خوبی سے برتا ہی، ع تیغیں برہنہ ہوگئی تھیں چوم کر نیام ؎

گرمی کی شدت

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی	ولہ	ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی
یہ سن کے تہلکہ صف اعدا میں پڑ گیا	〃	ٹوٹا یہ مورچہ وہ رسالہ بگڑ گیا
ہر غول میں علم سے علم جھک کے لڑ گیا		جو رہ گیا نشان وہ خجالت سے گڑ گیا
ڈر سے نہ بڑھاتے تھے جو سرکش قدم اپنے	ولہ	تیغیں بھی نیاموں میں چرائے تھیں دم اپنے

تھم گیا طبل و غا کی بھی وہ آواز کا جوش
ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلال حسن خاموش

ع اکبر سے بھی وغا میں کچھ آگے بڑھی رہی، ارحضرت علی اکبر کی تلوار کی تعریف ہے

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر
منہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن ادھر ادھر

بھاگے تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر
تھے تہ نشین نہنگ، مگر آب تھے جگر

ورطہ نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

خاک اڑتی تھی منہ پر حرم شیر خدا کے
تھا چیں جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

ع ڈھالوں کا یہ عالم تھا کہ چھپتی تھیں پس پشت،

صنعت طباق - یعنی دو متضاد یا متقابل چیزوں کو یکجا جمع کرنا، انیس نے اس صنعت کو اکثر برتا ہے، اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ برتا ہے۔

ع کھلتا نہیں کچھ آپ سے کیوں باندھے ہیں ہتھیار ۵

ہاتھ باندھے ہوں پے عقد دشادی کرنی
پاؤں لغزش میں ہیں پے دست خدا دی کرنی

تجھات میں

میری قدر کرے زمین سخن
وہ کہ میں نے تجھے آسمان کر دیا

یہ فصل اور یہ بزم عزا یاد گار ہے
وہ پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

ع گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے، ۵

استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان

ع بانو یہ رہے یاد ہمیں بھول نہ جانا،

ع فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر، ۵

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب
پر تھی رخوں پہ خاک تیمم سی طرفہ آب

نیزہ ہلا کے شاہ پہ آیا وہ خود پسند	مشکل کشا کے لعل نے کھولے تمام بند

ع تو عالم دانا ہے کہ میں نیچہ دان ہوں،
ع ثابت نہ ہوا کب صفِ اوّل ہوئی آخر،
ع پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور،
ع قرآن میں کیا خفی ہے کہ ہم پر جلی نہیں،

پیچھے کبھی قافلہ سے رہنا نہ انیس	اے عمر دراز! تیری کوتاہی ہے

ع نیزوں سے کہیں عقدہ کشا بند ہوا ہے،

مراعات النظیر، یعنی الفاظ کی رعایت، یہ وہی صنعت ہے جو آج عوام شعرا کا سرمایۂ کمال ہے اور جس کو مہذب ضلع جگت کہہ سکتے ہیں، امانت لکھنوی اس تہذیب کا پیغمبر ہے اُسکے مصحف کمال کی ایک آیت یہ ہے،

ع بھیڑیئے ملتے ہیں آنکھیں تری گرگابی پر،

منشی امیر احمد صاحب مرحوم فرماتے ہیں، ؎

کبوتر نہ ہوتا تھا جانے پہ راضی	تو بھیجا اُسے روغن قاز مل کر

چونکہ عوام کی تسخیر کا سب سے چلتا جادو یہی صنعت ہے، اور چونکہ لکھنؤ کی شاعری کے رگ و پے میں یہ صنعت سرایت کر گئی تھی، اسلئے میر انیس صاحب کے ہاں بھی اسکی بہتات ہے لیکن اتنی احتیاط ہے کہ ابتذال نہیں آنے پاتا اور بعض جگہ تو واقعی اس سے لطف پیدا ہو جاتا ہے، فارسی شعرا نے بھی اس کو برتا ہے لیکن نہایت فصاحت کے ساتھ مثلاً ؎

تا دل ہرزہ گرد من رفت بچین زلف او	زاں سفر دراز خود قصد وطن نمیکند

چشم بیمار ترا عین بلا مے بینم | لیکن ابرو ئے تو چیز لیست کہ بالائے بلاست

بہرحال میر انیس کی صناعی کے یہ نمونے ہیں ؎

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے بجائے | اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے

ہر تخل برومند ہے یا حضرت باری | پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

ع آتی ہوں میں سروں پہ ذرا فرق فرق سے، (تلوار کی زبان سے)

ع کیا مورچہ بندی تھی پئے قتل سلیمان، ؎

اصغر سے اگر اکبر مہرو نہ ملے گا | تم ہاتھ سے جاؤ گے تو بازو نہ ملے گا

فرماتے تھے حسین کہ او خانماں خراب | ولہ دریا کو خاک جانتا ہے ابن بوتراب

ع آب بقا بھی ہو تو میرے کام کا نہیں،

ع یہ پھول کربلا کے بسانے کو آئے تھے،

ع کٹ کٹ گئے وہ سیف زبانی دکھا گئی، (تلوار) ؎

خالی نہ گیا وار کوئی تیغ دوسر کا | ہاتھ اڑ گئے گر پاؤں بچا کر کوئی سر کا

اس ضعف میں لغزش سے نہ وہ پاؤں تھے آگاہ | ولہ پایا تھا ثبات قدم پائے ید اللہ

محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا | چلیے اب چوب دار مرگ آیا ہے

کونسا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے | کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

ع تنہیں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جان،

ع کافر جو تھا تو ہاتھ بھی مارا جنیو کا، ؎

اب تک یہ لڑائی کی نہیں ڈھنگ سے واقف | دونوں میں نہیں ایک بھی چور رنگ سے واقف

ع سب فوج کی تیغیں تھیں ادا آں شاہ کا دم تھا، ؎

لف و نشر

والیل والضحیٰ، رُخِ روشن خطِ سیاہ — لعل و غزال و گل، لبِ رخسار و چشم شاہ
ابرو و زلف رُخ شب قدر و ہلالِ ماہ — تیر و سنان زرہ مژہ و سُرمہ و نگاہ
چھٹتی تھیں بھاگی جاتی تھیں گرتی تھیں خاک پر — قبضوں سے تیغیں جسم سے رو جیں تنوں سے سر

تفصیل

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتی تھی خاک پر — پہنچوں سے ہاتھ شانوں سے بازو تنوں سے سر
قبضہ سے تیغ، بر سے زرہ، ہاتھ سے سپر — برچھی سے پھل، کمل سے زرہ، زین سے تبر

مہملہ

وہ طاہر و اطہر ہوا گر معرکہ آراء — معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمرو کو مارا — صمصام کا اک وار ہوا کس کو گوارا

واللہ گر اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اُس دم ہو جس ملکِ عدم ہو

کس کل اسد اللہ سا ہوا والد مرحوم — حلال مہم مالک کل طاہر و معصوم
صد درد و صد آزار حم دل و سرور مہموم — آسودہ ہر اک سالک گمراہ و محروم

معصوم کا دلدار ہو سالار امم ہو
اولاد کا اس عالم و عادل کا الم ہو

اس طرح کا والا ہمم اس طرح کا سردار — اس طرح کا عالم کا مدد اور مددگار
وہ مصدر الہام احد محرم اسرار — وہ اصل اصول کرم و اور دادار

حاصل اگر اک مرد دل آگاہ کو مارا

مارا اگر اسکو اسد اللہ کو مارا

تلمیح، میر صاحب نے اس صنعت کو نہایت خوبی سے برتا ہے، وہ عربی فقروں کو اس خوبی سے اشعار میں لاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے ؎

حر لپکا را بابی انت و امی یا شاہ	قابل عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ

ع اے خداوند جہاں خذ بیدی خذ بیدی ؎

انصاف کا اس وقت طلبگار ہوں تم سے		ہے کون مرا آیۂ لا اسئلکم سے
انہی رانڈوں میں ہے اک دختر فرزند نبی	ولہ	خوگر سینۂ دلبند رسول عربی
آفت فاقہ کشی بے پدری تشنہ لبی		دمبدم لب پہ یہ ہے این ابی این ابی
حامی ہے سب کا کون حیات و ممات میں	ولہ	کس کی ثنا ہے سورۂ والعادیات میں
کسکے لئے اکملت لکم دینکم آیا		اتممت علیکم کا ملا ہے کسے پایا
ہے انفسنا انفسکم کس سے اشارہ		اللہ نے کس گھر میں ثنا سے کو اتارا

انسانی جذبات یا احساسات

"یہاں تک جس محاسن کلام کا ذکر ہوا، وہ شاعری سے نہیں، بلکہ بلاغت سے تعلق رکھتے تھے، شاعری جس چیز کا نام ہے اسکی بحث اب شروع ہوتی ہے"

یہ شاعری کی اصل روح رواں ہے، اگر مل صاحب کی رائے تسلیم کی جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے، شاعری درحقیقت مصوری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مادیات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا اسقدر دشوار نہیں جسقدر غیر محسوسات، اور غیر مادی اشیاء کا نقشہ اتارنا مشکل ہے۔ ایک درخت کی تصویر کھینچنی ہو تو کسی قسم

کی تخیل اور دیدہ وری کی ضرورت نہیں۔ ٹہنیاں پھل پھول۔ پتے سب سامنے ہیں اور ہر شخص ان کو محسوس کر سکتا ہے۔ مصوّر کا صرف کمال یہ ہے کہ ہر چیز کا پورا نقشہ کھینچدی لیکن رنج۔ غم۔ جوش محبت غیظ بیقراری بیتابی مسرت خوشی محسوس اور مادی چیزیں نہیں ہیں۔ آنکھ انکو محسوس نہیں کر سکتی البتہ دل پر انکا اثر ہوتا ہے لیکن یہ اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا۔ اسلئے اُنکی ہو بہو اور اصلی تصویر اُتارنا مشکل ہے۔

میر انیس کا اصلی جوہر یہیں آکر کھلتا ہے، اور یہیں اُنکی شاعری کی حد، اُن کے ہمعصروں سے بالکل الگ ہو جاتی ہے۔ انسانی جذبات کی سینکڑوں قسمیں ہیں اور پھر ہر ایک کے مختلف مراتب اور مدارج ہیں۔ مثلاً جذبات انسانی کی ایک قسم محبت ہے لیکن محبت کے بھی مختلف اقسام اور مدارج ہیں۔ باپ بیٹے کی محبت۔ بھائی بھائی کی محبت۔ یار آشنا کی محبت۔ آقا اور غلام کی محبت وغیرہ وغیرہ۔ میر انیس کے مرثیوں میں نہایت کثرت سے ان جذبات، اور اُنکے مختلف مدارج کا ذکر ہے، لیکن جس جگہ جس چیز کو لیا ہے اُسکے کمال کیساتھ اُسکی تصویر کھینچی ہے کہ اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے،

مثال ۱۔ حضرت امام علیہ السلام نے مدینہ سے جب سفر کیا تو تمام کنبہ ساتھ تھا۔ لیکن حضرت صغرا، چونکہ بیمار تھیں، اسلئے انکو ساتھ نہیں لیا ہے رخصت کے وقت جب گھر میں تشریف لائے تو چاہتے ہیں کہ صغرا پر یہ راز ظاہر نہ ہونے پائے لیکن یہ راز کب چھپ سکتا تھا۔ بہرحال، حضرت امام حسینؑ خود صغرا سے رخصت ہونے کیلئے اُنکے پاس تشریف لیگئے صغرا کو اصرار ہے کہ میں تنہا نہیں رہ سکتی، حضرت سمجھاتے ہیں کہ تم اس بیماری کیحالت میں کیونکر چل سکتی ہو، وہیں ملنیں

اس وقت باپ بیٹی۔ ماں بھائی۔ بہنوں، پر محبت کا جو اثر ہے، اور جس طرح اس کا
ظہار ہوا ہے اُسکی تصویر اس طرح کھینچی ہے، ۵

ہ کہتی تھی زینت کہ پکارے شہ عادل	تیار ہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
طے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل	رخصت کرو لوگوں کو بس اب دینے سے حاصل
چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقت سحر ہے	
بچے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے	
صت کرو ان کو کہ جو ہیں ملنے کو آئے	کہدو کوئی گہوارۂ اصغر کو بھی لائے
ان سکینہ کہیں آنسو نہ بہائے	جانے کی خبر میری نہ صغرا کہیں پائے
ڈر ہے کہیں گھبرا کے دم اسکا نہ نکل جائے	
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے	
ن کر یہ سخن بانوئے ناشاد پکاری	میں لٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری
ں ہو گئی ہے فاطمہ صغرا مری پیاری	یہ کس کیلئے کرتے ہیں سب گریہ و زاری
اب کس پہ میں اس صاحب آزار کو چھوڑوں	
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں	
ہوں میں کلیجہ نہیں سینہ میں سنبھلتا	صاحب مرے دل کو ہی کوئی ہاتھوں سے ملتا
تو اُسے لے چلتی پہ کچھ بس نہیں چلتا	رہ جاتیں جو بہنیں بھی تو دم اسکا بہلتا
دروازے پہ تیار سواری تو کھڑی ہے	
پر اب تو مجھے جان کی صغرا کی پڑی ہے	
ھنیں کبرا کہ بہن آنکھ تو کھولو	کہتی تھی سکینہ کہ ذرا منہ سے تو بولو

ہم جاتے ہیں تم اُٹھ کے بغلگیر تو ہو لو
چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رو لو

تم جن کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا
پھر گھر میں جو ڈھونڈو گی تو اکبر نہ ملے گا

ہوشیار ہو کیا صبح سے بیہوش ہے خواہر
اصغر کو کرو پیار کلیجے سے لگا کر
چھاتی سے لگوا اُٹھ کے کھڑی روتی ہیں مادر
ہم روتے ہیں دیکھو تو ذرا آنکھ اُٹھا کر

افسوس اسی طور سے غفلت میں رہو گی
کیا آخری بابا کی زیارت نہ کرو گی

سخن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے
بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
منہ دیکھ کے بانو کا سخن لب پہ نہ لائے
کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اسکو بچائے

جس صاحب آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دانستہ میں کیونکر اُسے لیجاؤں سفر میں

کہہ کر یہ سخن بیٹھ گئے سید خوشخو
اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو
بیمار نے پائی گل زہرا کی جو خوشبو
آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو

ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں
کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں اماں

ماں نے کہا ہاں ہاں وہی آئے ہیں تیرے جاں
جو کہنا ہو کہہ لو کہ یہاں اور ہے ساماں
دیکھو تو اُدھر روتے ہیں بی بی شہ ذیشاں
صغرا نے کہا اُنکی محبت کے میں قربان

وہ کونسا ساماں ہے جو یوں روتے ہیں بابا
کھل کر کہو کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لئے باہر
نہ فرش نہ ہے مسند فرزند ہمسر

دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغر
اُجڑا ہوا لوگو نظر آتا ہے مجھے گھر

کیا منہ سے تو بولو مرادم گھٹتا ہے آماں
کیا سبط پیمبر سے وطن چھٹتا ہے آماں

شبّیر کا منہ تکنے لگی بانوئے مغموم
صُغرا کیلئے رونے لگیں زینب و کلثوم

بیٹی سے یہ فرمانے لگے سیّد مظلوم
پردہ رہا اب کیا تمہیں خود ہو گیا معلوم

تم چھٹتی ہو اسواسطے سب روتے ہیں صُغرا
ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صُغرا

اب شہر میں اک دم ہے ٹھہرنا مجھے دشوار
ہیں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحب آزار

پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار
تکلیف تمہیں دو یہ مناسب نہیں زنہار

غربت میں بشر کیلئے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

کوں چلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام
جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام

بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام
دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام

صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گذر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صُغرا نے کہا کھانے سے خود ہی مجھے انکار
پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار

کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کر سکتی یہ بیمار
بستر پہ فقط آپ کا ہے شربت دیدار

گرمی میں بھی راحت سے گذر جائیگی بابا

آئے گا پسینہ تب اُتر جائے گی بابا

کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہی میں
اُف تک کروں بھر کے اگر آگ جگر میں

بھولے سے بھی شب کو نہ کراہونگی سفر میں
قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں

ہو جانا خفا راہ میں گر روئیگی صغرا
یا نیند کب آتی ہے جو واں سوئے گی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بیچین ہو مادر
ہر صبح میں پی لونگی دوا آپ بنا کر

رن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر
لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر

میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ
میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہے جو را

کھلوائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ
ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی کی نہ ہو چا

ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
ہے مصلحت حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

اے نور بصر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا
تو مجھ سے بہلتی مرا دل تجھ سے بہلتا

تب ہی تجھے اور غم سے جگر ہے مرا جلتا
یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلتا

جز صبر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
واں تیر ہے ہاتھ سے یہیں کھو نہیں سکتا

بیمار بصد غم
چھوتے سے عیاں تھا کہ چلیں آپ موئے ہم
میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہے اسد

وہ درد ہے جس درد سے چارا نہیں صغرا
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا کوئی کسی کا نہیں رہتا
سب کی یہی مرضی ہے کہ مر جائیے یہ بیمار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار
اک ہم ہیں کہ ہیں سب کے فدا سب کے ہیں غمخوار

بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبر
اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر
وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر

پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

کیا ان کو پڑی تھی جو وہ غم کھانے کو آتے
میں کون؟ جو صورت مجھے دکھلانے کو آتے
ہوتی جو غرض چھاتی سے لپٹانے کو آتے
زلفیں جو الجھتیں تو سلجھوانے کو آتے

کل تک تو مرے حال پریشان پہ نظر تھی
تقدیر کے اس پیچ کی مجھ کو نہ خبر تھی

مالوس سکینہؑ سے ہیں عباسؑ و اکبرؑ
میں کون ہوں؟ جو میری خبر پوچھتے آکر
سرسبز رہے خلق میں نوبادۂ حیدرؑ
شادی میں بلائیں مجھے یہ بھی نہیں باور

بے دولہ نے منہ کو چھپا لیتے ہیں ابھی سے
میں جیتی ہوں اور آنکھ چرا لیتے ہیں ابھی سے

کس سے کہوں اس درد کو میں بیکس و رنجور
بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور

اماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی میں ہوں مجبور | ہمراہی بیمار کسی کو نہیں منظور

دنیا سے سفر رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

سب بیبیاں رونے لگیں سُن سُن کے یہ تقریر | چھاتی سے لگا کر اُسے کہنے لگے فضہ
تو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر | مُنہ دیکھ کے چُپ رہ گئی وہ بیکس و دلگیر

نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا مُنہ سے یہ آنسو نکل آئے

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ | اکبر کو بلاؤ علی اصغر کو بھی لاؤ
آئے علی اکبر تو کہا شاہ نے آؤ | روٹھی ہے بہن تم سے گلے اُسکو لگاؤ

چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کر لو
لینے انہیں کب آؤ گے اقرار تو کر لو

پاس اُن سے اکبر نے یہ کی پیار کی تقریر | کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صُغرا مری تقصیر
چلانے لگی چھاتی پہ مُنہ رکھ کے وہ دلگیر | محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر

صدقے ترے سر پر سے اُتارے مجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے | تلوار لئے شان سے چلنے کے میں صدقے
افسوس ہے ان ہاتھوں کے ملنے کے میں صدقے | کیوں روتی ہو اشک آنکھوں سے ڈھلنے کے میں صدقے

جلد آن کے بہناں کی خبر لیجیو بھائی
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی

پیارے مرے بھیا مرے مہ رو علی اکبر
چھپ جائینگے آنکھوں سے یہ گیسو علی اکبر
یاد آئیگی یہ جسم کی خوشبو علی اکبر
ڈھونڈھیں گی یہ آنکھیں تمہیں ہر سو علی اکبر

دل سینے میں کیونکر نہ وبالا نہ رہے گا
جب چاند چھپے گا تو اُجالا نہ رہے گا

کیا گذریگی جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی
کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی
تشریف خدا جانیے کب لاؤ گے بھائی
کی دیر تو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے بھائی

کیا دم کا بھروسہ کہ چراغِ سحری ہیں
تم آج مسافر ہو تو ہم کل سفری ہیں

ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا
صحت سے جو ہیں انمیں کہاں میرا ٹھکانا
بھیا جواب آنا تو مری قبر پہ آنا
ہم گور کی منزل کی طرف ہونگے روانا

کیا لطف کسی کو نہیں گر چاہ ہماری
وہ راہ تمہاری ہے تو یہ راہ ہماری

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرا تری قرباں
گھبرا کے نہ اب تن سے نکلجائے مری جاں
بے کس مری بچی ترا اللہ نگہباں
صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آں

کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
کنبہ کے لئے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ وزاری
اصغر مرا رونا ہے صدا سن کے تمہاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اُٹھا کر یہ پکاری
آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم

اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو ساتھ اور بہن جا نہیں سکتی
تب ہی تمہیں چھاتی سے میں لیٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی
رکھ لوں تمہیں آں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمہیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

معصوم نے جسدم یہ سنی درد کی گفتار
اصغرؑ کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار
لے لے کی بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار
جھک جھک کے دکھاتی ہو مجھے آخری دیدار

دنیا سے کوئی دن میں گذر جائیگی اصغرؑ
تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مر جائے گی اصغرؑ

مثال ۲ - انہی واقعات کو ایک اور موقع پر لکھا ہے ؎

باتیں یہ ابھی تھیں کہ شہِ بحر و بر آئے
دیکھا رخِ ہمشیر کو اور اشک بہائے
ماں بیٹھی تھی اصغرؑ کو جو چھاتی سے لگائے
روتے ہوئے تشریف شہ دیں وہیں لائے

بیٹی شہِ ذی جاہ کی تعظیم کو اٹھی
بستر سے عصا تھام کے تعلیم کو اٹھی

جلد اسکے قریب آکے یہ کہنے لگی حضرت
بیٹھو کہ ابھی اٹھنے کی تم میں نہیں طاقت
اک ضعف کی تصویر ہو ایسی ہی نقاہت
کیوں رات کو کیسی رہی بی بی کی طبیعت

تپ میں جو کراہی تھیں تو گھبرائے تھے اصغرؑ
بیہوش تھیں تم شب کو بھی ہم آئے تھے اصغرؑ

صحت دے تمہیں حق یہی بابا کی دعا ہے
اولاد کو راحت ہو تو جینے کا مزا ہے

اب بادیہ پیمائی ہے ایذا ہے بلا ہے
کیا جانیے تقدیر میں کیا ہے

دل جلتا ہے جب تب میں تمہیں پاتا ہوں صغرا
اس رنج میں ہیں اور گھلا جاتا ہوں صغرا

ایسا سفر صعب اور اس طرح کا بیمار
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائے کہیں راہ میں آزار

کیا نرگسی آنکھوں سے نقاہت ہی نمودار
سب زرد ہے ہر ازمان حرارت سے تن زار

چہرے پہ کسی روز بحالی نہیں پاتا
سرعت سے کبھی نبض کو خالی نہیں پاتا

دم چڑھتا ہے بستر سے اٹھاتی ہو اگر سر
بی بی کہو محمل میں چڑھا جائیگا کیونکر

گھر میں تمہیں پانی کی جھڑک رہتی ہے دن بھر
پھر کیا ہو کسی دن جو نہ پانی ہو میسر

تم جانے کے قابل نہیں میں رہ نہیں سکتا
سب سے ہے وہ تشویش کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

گھر میں تمہیں چھوڑوں یہ نہیں دل کو گوارا
لیجاؤں تو بچنا نہیں ممکن ہے تمہارا

بچوں میں کوئی تم سے زیادہ نہیں پیارا
مجبور ہوں بے ہجر نہیں اب کوئی چارا

فرقت میں سدا نالۂ و فریاد کروں گا
اترونگا جو منزل پہ تمہیں یاد کروں گا

صغرا نے کہا آپ کی الفت کی میں قرباں
پھر کس کو ہو گر آپ کو لونڈی کا نہ ہو میساں

صدقے گئی صحت کا بھی ہو جائیگا ساماں
مولا کی توجہ ہے ہر اک درد کا درماں

جس پر نظر لطف مسیح دوسرا ہو
برسوں کا ہو بیمار تو اک دم میں شفا ہو

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت
تپ کی بھی ہے شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت
پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت

حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقین ہے
اب تو مرے منہ کا بھی مزا تلخ نہیں ہے

کیوں روتے ہو بابا یہ تردد کی نہیں جا
سب سہل ہے کچھ مجھکو نہیں ہونیکی ایذا
پہلے سے کہے دیتی ہوں اے سیدوالا
میں خانہ ویراں میں نہیں رہنے کی تنہا

اب روح مرے جسم میں گھبراتی ہے بابا
ان باتوں سے کچھ بوئے فراق آتی ہے بابا

مرجاؤنگی بچھڑی جو مسیح دوسرا سے
صحت مجھے ہوجائیگی حضرت کی دعا سے
کٹ جائیگا اندوہ سفر فضل خدا سے
بیماری میں جان آئیگی جنگل کی ہوا سے

سب ساتھ ہیں سوؤنگی نہ غم کھاؤں گی بابا
لیٹی ہوئی محمل میں چلی جاؤں گی بابا

شہ نے کہا تم حال سے میرے نہیں آگاہ
مجبور نکلتا ہوں میں اس شہر سے واللہ
آفت کا ہے بی بی یہ سفر خوف کی ہے راہ
بیمار ہو کس طرح سے لیجاؤں تمہیں آہ

آزار رسیدہ ہوں گرفتار بلا ہوں
گھر چھوڑ کے جلادوں کی صرصر میں چلا ہوں

وہ صعب پہاڑوں کا سفر اور وہ گرمی کی لوئیں
دن رات مسافر پہ کبھی دھوپ کبھی اوس
اک ایک قدم رنج والم حسرت و افسوس
ہوتا نہیں جز خار کوئی آکے قدموں

آرام کہیں راہ میں جانی نہیں ملتا

جنگل ہیں وہ پُر ہول کہ پانی نہیں ملتا

تھوڑے ہی دنوں ہوئیگی کنبے سے جدائی
پردیس سے آکر تمہیں لیجائینگے بھائی
کی مجھ سے نہ گر کوفے کی خلقت نے برائی
ممکن ہے کہیں اور نہ کروں وعدہ وفائی

خوش ہوگا تم اب دل پہ اگر صبر کروگی
مرجاؤں گا جب میں تو نہ کیا صبر کروگی

ثابت ہوا اصغر اپہ کہ اب ہم رہے گھر میں
بس پھر گئی تنہائی کی تصویر نظر میں
اک جوش ہوا آنسوؤں کا دیدۂ تر میں
صدمے ہی کھٹکنے کی پڑا ہوئی سر میں

شکل اپنی شب ہجر جو دکھلا گئی اس کو
کانپا یہ تن زار کہ تپ آگئی اس کو

تھرائی ہوئی اٹھ کے گری شاہ کے قدم پر
کی عرض کہ مرجاؤنگی یا سبط پیمبر
تنہائی میں بابا میرا دل بہلے گا کیونکر
سب بیٹیاں ہیں کیا میں نہیں آپکی دختر

بے آپکے اس گھر میں نہ باشاہ رہونگی
اچھا میں کنیزوں ہی کے ہمراہ رہونگی

سب رونے لگے سُن کے یہ بیمار کی تقریر
گھبرا کے یہ فرمانے لگے حضرت شبیر
چلائی سکینہ کہ میں صدقے مری ہمشیر
تم بیٹی کو سمجھاؤ کچھ اے بانوئے دلگیر

کمسن ہیں مسافر مجھے تشویش بڑی ہے
دن چڑھتا ہے اور آجکی منزل بھی کڑی ہے

یہ سنتے ہی بی بی کی چھاتی امنڈ آئی
چلائی وہ ناشاد کہ ہے ہے مری جائی
زینب نے کہا گھر سے نکلتا ہے یہ بھائی
مرجانے سے کچھ کم نہیں اصغر کی جدائی

گھر لٹتا ہے کس طرح قیامت نہ بپا ہو
پہلا ہے یہ غم آگے خدا جانیئے کیا ہو

آغاز سفر میں تو یہ ماتم ہے یہ کہرام
کیا دیکھیں دکھاتا ہے اس آغاز کا انجام

جنگل ہو کہ بستی ہو کہاں راحت و آرام
ماں روئے گی بیٹی سے بچھڑ کر سحر و شام

بستی بھی ہے جنگل جو کلیجہ نہ ہو پر میں
بھولیگی؟ وہ چھوڑینگے اکیلا جسے گھر میں

صغرا نے کہا آپکی باتوں کے میں قرباں
تم جان بچا لو کہ میں لونڈی ہوں تمھاری جان

بیٹی ہو علی کی مری مشکل کرو آساں
جیتی رہی صغرا تو نہ بھولیگی یہ احسان

کچھ بات سجز گریہ و زاری نہیں کرتیں
اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

پیاری ہیں جو وہ بیٹیاں وہ جائینگی ہمراہ
کیا انس کہ میں گور کنارے سے بھی لوٹوں آہ

بابا کو نہ اماں کو نہ بہنوں کو مری چاہ
سب جیتے رہیں خیر ہمارا بھی ہے اللہ

بھولے سے نہ اب خاطر ناشاد کرینگے
میں قبر میں جب ہونگی تو سب یاد کرینگے

کیا خلق میں لوگو کوئی ہوتا نہیں بیمار
ہے کونسی تقصیر کہ سب ہوگئے بیزار

زندہ ہوں پہ مردے کی طرح ہوگئی دشوار
کیوں بھاگتے ہیں سب مجھے ہے کونسا آزار

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اسکا
وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

وہ چاہنے والا ہی مصیبت میں جو کام آئے
میں سب کی ہوئی اور کوئی میرا نہ ہوا ئے

اس راہ میں ہمراہ کنیز بن تو ہوں اے وائے
کہنے کی جو ہو چاہنے والی وہی رہ جائے

بیماری مزمن ہیں دوا خوب ہوئی ہے
تجویز مرے واسطے کیا خوب ہوئی ہے

تنہائی میں رونے سے اتر جائیگی یہ تپ
ہاں درد بھی سر میں مرے ہوگا نہیں اب
تڑپوں گی نہ جائیگی یہ اعضا شکنی سب
بہتر یہی ترکیب ہے نسخہ یہی اب

کم ہوگی حرارت الم و رنج و محن میں
غم کھانے سے جائیگی طاقت مرے تن میں

تنہائی میں شدت بھی نہ ہوگی خفقان کی
بیمار کا دل بہلیگا وحشت سے مکان کی
تڑپونگی نہ فرقت میں امام دو جہان کی
شفقت مجھے یاد آئیگی بہنوں کی زبان کی

فرقت میں مری طرح جگر کس سے سنبھلتا
میں گھر میں نہ ہوتی تو یہ گھر کس سے سنبھلتا

سب چاہنے والے ہیں کروں کس کی شکایت
بابا کی یہ تقدیر ہے بہنوں کی یہ صورت
چھوڑا ہمیں بس دیکھ لی اماں کی محبت
بولیں نہ پھوپھی جان بھی کچھ واہ ری قسمت

فرقت کا الم میرے کلیجہ کو چھری ہے
سب اچھے ہیں لوگو مری تقدیر بری ہے

عاشق مرے مشہور ہیں بھیا کی میں واری
دو دن سے خبر بھی نہیں لی آکے ہماری
حاسم کو غرض کیا جو سنیں گریہ و زاری
میں کون؟ سکینہ ہی چچا جان کو پیاری

اللہ تو ہے گر کوئی غمخوار نہیں ہے
مٹی مری کچھ قبر کو دشوار نہیں ہے

اس وقت محبت مری ہو جائیگی خالی
جب راہ میں خط پڑھ کے کہینگے شہ عالی

لو مر گئی کہنے کی جو تھی چاہنے والی
آباد جو حجرہ تھا وہ اب ہو گیا خالی

قسمت نے سنائی خبر مرگ سفر میں
وہ قبر میں سوئی جسے چھوڑ آئے تھے گھر میں

پھر ہم نہیں ملنے کے کوئی لاکھ ہو جویا
سب رو کے کہینگے کہ اُسے ہاتھ سے کھویا

عالم سے وہ بیگانہ ہے جو قبر میں سویا
کیا نفع اُسے کوئی کڑھایا کوئی رویا

پُرسے کے لئے جمع ہوئے لوگ تو پھر کیا
پردیس میں کہنے نے رکھا سوگ تو پھر کیا

یاں ذکر یہ تھا آئے جو رونے ہوئی اکبر
سُرخ آنکھیں نحیف اور زرد تھا غم سے رنگ اور

چلائی بہن بھائی کی چھاتی سے لپٹ کر
اس سینے کے اُن ہاتھوں کے قربان یہ خواہر

فریاد ہے بے موت بہن مرتی ہے بھائی
تقدیر ہمیں تم سے جدا کرتی ہے بھائی

بھیّا مری تنہائی پہ آنسو نہ بہاؤ
وہ دن ہوں کہ پھر خیر سے اس شہر میں آؤ

ہر چند یہ مشکل ہے کہ جیتا ہمیں پاؤ
صدقے گئی پھر آنیکا وعدہ کئے جاؤ

عرصہ ہو تو خط لکھ کے طلب کیجیو بھائی
اب بیاہ میں مجھ کو نہ بھلا دیجیو بھائی

رونے کا اُدھر غل تھا کہ غصہ یہ پکاری
تیار ہے ناموس محمدؐ کی سواری

دروازہ کے نزدیک ہے زینبؑ کی عماری
کیا دیر ہے اب آئے ید اللہ کی پیاری

ہر بار فنا فوں کے قریب آتے ہیں عباسؑ

اب جلد سواری ہو یہ فرماتے ہیں عباسؑ

شبیرؑ نے رو کر کہا لو جاتے ہیں صغراؑ
جلد آتے ہیں یا خود نہیں بلواتے ہیں صغراؑ
ہم سب تری تنہائی کا غم کھاتے ہیں صغراؑ
جان اپنی نہ کھونا نہیں سمجھاتے ہیں صغراؑ

قربان پدر آب و غذا ترک نہ کیجو
بڑھ جائے گا آزار دوا ترک نہ کیجو

بیٹی سے یہ فرما کے چلے قبلۂ عالم
ناموس محمدؐ بھی چلے ساتھ بصد غم
صغراؑ بھی چلی جاتی تھی روتی ہوئی باہم
ہمسائیاں باندھے ہوئے تھیں حلقۂ ماتم

راحت تھی جو سب کو شہ ذیجاہ کے دم سے
ایک پیٹتی تھی ایک لپٹتی تھی قدم سے

غل تھا شہ ابرار خدا حافظ و ناصر
رانڈوں کے مددگار خدا حافظ و ناصر
اے خلق کے سردار خدا حافظ و ناصر
محتاجوں کے غمخوار خدا حافظ و ناصر

دکھ فاقوں کی غربت کے الم کس سے کہیں گے
مشکل کوئی اب ہوگی تو ہم کس سے کہینگے

صغراؑ کو نقاہت سے نہ تھی طاقت گرفتار
اٹھی کئی بار اور گری در پہ کئی بار
جس ناقے پہ تھی بانوئے ناشاد دل افگار
اس ناقے کے پاس آکے یہ چلائی وہ بیمار

قربان گئی آخری دیدار دکھا دو
اماں مجھے اصغرؑ کو پھر اک بار دکھا دو

مضطر ہوئی سن کر یہ سخن بانوئے بے پر
پرتے سے جگر بند کا منہ کر دیا باہر
بیٹی سے کہا دست پسر ماتھے پہ رکھ کر
لو آخری تسلیم بجالاتے ہیں اصغرؑ

مُنہ زرد ہے رخساروں پہ آنسو بھی ہیں
یہ نرگسی آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہے ہیں

تھرائے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری
اس ہاتھ کے اس چاند سی ماتھے کی میں واری
آخر کوئی دن میں ہی بس اب ہے تمہاری
بھیا نہیں جینے کی میں فرقت میں تمہاری

جب آ کے پھر اس جھولے کو آباد کرو گے
تم بھی مری گودی کو بہت یاد کرو گے

عباس سے شہ نے کہا اے ثانی حیدر
مر جائیگی اب فاطمہ صغرا مری دختر
حمالوں سے کہہ دو کہ بڑھیں اونٹوں کو لیکر
اسواریوں کے ساتھ رہیں قاسم و اکبر

احباب جو روتے ہیں تو غم کھاتے ہیں ہم بھی
سب شہر کے ناکے پہ تمہیں آتی ہیں ہم بھی

مثال ۳ ۔ حضرت علی اکبر کی رخصت اور باپ ماں کی حالت

مومن مرنے کو ہمشکل بنی جاتا ہے
دولت بانوے بیکس پہ زوال آتا ہے
کیا الم ہے کہ جگر سینے میں تھرّاتا ہے
داغ بیٹے کا فلک باپ کو دکھلاتا ہے

ماں تڑپتی ہے شہ جن و بشر روتے ہیں
کس جواں بیٹے سے ماں باپ جدا ہوتے ہیں

بیٹا کیا جاتا ہے ہوتا ہے بھرا گھر برباد
ہوتی ہے دولتِ فرزند پہ پیہم برباد
کرتے ہیں اپنی جوانی علی اکبر برباد
جان کھوتا ہی پدر ہوتی ہے مادر برباد

داغ اولاد ہے یاں صبر کا مقدور نہیں
پہلے فرزند سے مر جائیں تو کچھ دور نہیں

ایسا بیٹا جسے اٹھارہ برس پالا ہے
گھر سے جاتا ہی وہی گھر کا جو اجالا ہے
تفرقہ چرخ ستمگر نے عجب ڈالا ہے
کیا کروں صبر کلیجہ بھی تہ و بالا ہے

دل کی بینائی ہر اک آن سوا ہوتی ہے
روح ماں باپ کے قالب سے جدا ہوتی ہے

داغ اولاد نہیں آہ اٹھایا جاتا
ایسا بیٹا نہیں ہاتھوں سے گنوایا جاتا
درد وہ ہے کہ زباں پر نہیں لایا جاتا
زخم وہ ہے کہ جگر پر نہیں کھایا جاتا

داغ فرزند حسینؑ ابن علیؑ سے پوچھو
نوجواں بیٹے کا غم باپ کے جی سے پوچھو

سوچیں سب صاحب اولاد کہ کیا مشکل ہے
تا کجا صبر کہ ماں باپ کا آخر دل ہے
پہلے فرزند سے بابا کا جگر گھائل ہے
زخم اکبرؑ نے نہیں کھائی یہاں بسمل ہے

پار جب سینے سے برچھی کی انی ہووے گی
کیا غضب ہووے گا کیا سینہ زنی ہووے گی

چاند مکھڑا ہے وہ کمر اور کمر شاد ہے خم
تیغ سنجتا ہے پسر باپ کے دم میں نہیں دم
نشان سے نشانے پہ رکھتا ہی کلیجہ وہ ضیغم
تیر غم لگتے ہیں مادر کے جگر پر پیہم

تن پہ چار آئینہ سینے کا وہاں سامان ہے
چار پارہ ہے جگر ماں کا پدر حیران ہے

واقعی دولت اولاد عجب دولت ہے
اسکو راحت ہی تو ماں باپ کچھ بھی راحت ہے
نوجواں بیٹے کا مرنا بھی بڑی آفت ہے
زندگی تلخ ہی پھر جینے کی کیا لذت ہے

اُس کا دل دیکھو چھٹے باپ سے جس کا بیٹا

اور بیٹا بھی تو ہمشکل نبی سا بیٹا

ہیں مسین بھیگتی اٹھارہ برس کا ہے سن
رنج میں کاٹی ہیں دکھ درد کی راتیں گن گن

منتیں مانی ہیں مادر نے مرادوں کے ہیں دن
پالنے والی کو چین آئیگا کیونکر اُس بن

ماں کو حسرت ہے دلہن بیاہ کے گھر لانے کی
فکریاں عین جوانی میں ہے مر جانیکی

ماں کو منظور ہے جاوے نہ کہیں نور نظر
باپ کو غم ہے کہ چھٹتا ہے برابر کا پسر

اور فرزند کو درپیش ہے دنیا سے سفر
سیدھی ہو سکتی نہیں خم ہوئی جاتی ہے کمر

بھائی کے واسطے قاسم کی دلھن روتی ہے
پکڑے دامان قبا چھوٹی بہن روتی ہے

رن کو جانیکے لئے بانو کے جائے ہیں کھڑے
شوق ہے جنگ کا ہتھیار لگائے ہیں کھڑے

ہاتھ جوڑے ہوئے گردن کو جھکائے ہیں کھڑے
ماں سے مرنے کیلئے آنکھ چرائے ہیں کھڑے

شاہ خاموش ہیں پر بول نہیں سکتے ہیں
کبھی بانو کا کبھی بیٹے کا منہ تکتے ہیں

دل سے فرماتے ہیں یہ دیکھئے اب ہے ناہی کیا
بانو دیتی ہے کہ بیٹے کو نہیں دیتی رضا

صبر کی جا نہیں ہونا ہے پسر ماں سے جدا
اب خدا خیر کرے ہے یہی مر جانیکی جا

جسم کانپے گا قلق ہوگا غش آجائے گا
حرف رخصت کا نہ بانو سے سنا جائیگا

بانو کہتی ہے کہ کیا کہتے ہیں اکبر بادشاہ
ان کے جو دل میں ہے کچھ آپ ہیں اُس سے آگاہ

دیکھتی ہوں میں کہ حضرت کی بھی حالت ہے تباہ
ماجرا کیا ہے یہ کچھ مجھ سے تو کہیئے للہ

مُنہ سے کچھ کہتے نہیں پاس ادب کرتے ہیں
کونسی چیز ہے جو ماں سے طلب کرتے ہیں

شاہ فرماتے ہیں بانو سے کہ اے نیک نہاد
رازداں ہوتی ہے ماں بیٹے کی بابا سے زیاد
پوچھو اکبر سے کہیں گے جو کچھ اُنکی ہے مراد
حق نہ ماں باپ کو دکھلائے فراق اولاد

تھا مقدر میں کہ سب ہو دیں جدا ہم دیکھیں
اب بھی اُٹھ جائیں جہاں سے تو نہ یہ غم دیکھیں

سُن کے یہ بانو نے فرزند سے پوچھا رو رو
کیا کہا چاہتے ہو ماں سے تو اے لال کہو
ہاتھ کیوں جوڑے ہو دامان ہاتھ تھونکے ہو ضد کرتے ہو
کہا اکبر نے رضا مرنے کی اماں ہمیں دو

صبر فرماؤ کہ اب تم سے جُدا ہوں گے ہم
دودھ بخشو ہمیں بابا پہ فدا ہوں گے ہم

یہ سخن سنتے ہی فرزند سے ماں ہو گئی زرد
دھیان آیا کہ چلا ہائے پسر ہے نبرد
مُردنی چھا گئی چہرے پہ اُٹھا دل میں درد
دیکھ مُنہ بیٹے کا کہنے لگی بھر کر دم سرد

تم سے بچھڑونگی تو واری میں کدھر جاؤنگی
پھر نہ رخصت کا سخن کہنا کہ مر جاؤں گی

کہا اکبر نے کہ بہتر ہے نہ دیجئے رخصت
خیر مرنے کو نہ جاوینگے نہ کیجئے رخصت
میرے بابا سے ہوئے بھائی بھتیجے رخصت
مجھ کو بھی دھیان یہ تھا آپ سے لیجے رخصت

ماں سے فرزند کو تکرار کا یارا کیا ہے
تابع حکم ہیں ہم زور ہمارا کیا ہے

سب نے قربان کئی زہرا کے پسر پر فرزند
کٹ گئی تیغوں سے کس کس کے جگر کی پیوند

میں نے چاہا تھا کہ ہو آپکا بھی نام بلند
پر تعجب ہے کہ آئی نہ مری عرض پسند

آپ کہتے ہیں نہ جاؤ تو نہ جاویں گے ہم
اپنے ہم چشموں کو پھر منہ نہ دکھائیں گے ہم

جایئے گا سوئے یثرب تو نہ جائیگا غلام
کام بابا کے نہ آئے تو وطن سے کیا کام
خیمے کے لوٹنے کو آئیگا جب لشکر شام
قید ہم ہونگے کہ لڑنیکا یہی ہے ہنگام

آبرو پاتے جو سر تیغ سے کٹواتے ہم
طوق و زنجیر کی ایذا سے بھی چھٹ جاتے ہم

آج جو مرتے تو داخل شہدا میں ہوتے
پائینتی باپ کے آرام سے سوتے
لاش پر کہتے ملک ہائے علی کے روتے
حشر تک ہم کو عزادار جہاں میں روتے

جو ہے منظور ہمیں آپکو منظور نہیں
اب بھی فرماؤ تو میدان و غا دور نہیں

بولی ماں ہو گئے آزردہ میں واری بیٹا
گلہ آمیز یہ باتیں ہیں نہ تمہاری بیٹا
باپ پیارا ہے تمہیں ماں نہیں پیاری بیٹا
دھیان اپنا ہے نہیں فکر ہماری بیٹا

پہلو بابا کا تو آباد کیا چاہتے ہو
پالنے والی کو برباد کیا چاہتے ہو

علی اکبر مری محنت کی طرف دھیان کرو
اماں واری مری بستی کو نہ ویران کرو
چھوڑ کر ماں کو نہ تم کوچ کا سامان کرو
پھر فدا ہو جیو پہلے مجھے قربان کرو

میرے جیتے نہ قدم گھر سے نکالو بیٹا
اپنی مادر کا جنازہ تو اٹھا لو بیٹا

ماں کی تقریر سے مایوس ہوئے جب اکبر
اشک آنکھوں سے بہے چاند سے رخساروں پر

رکھدی تلوار لگے کھولنے ہاتھوں سے کمر
بانو گھبرا گئی ٹکڑے ہوا زینب کا جگر

لے کے بیٹے کی بلائیں کہا کیوں روتے ہو
لو نہ روکوں گی میں کاہے کو خفا ہوتے ہو

رو کے کہنے لگے بیٹے سے امام خوشخو
ماں تو دیتی ہے رضا مرنے کی آزردہ ہو

پھر کہا بانو سے اب مرنیکی رخصت نہیں دو
تھا مقدر میں یہی صبر کرو شکر کرو

یہ دعا مانگو کہ تڑپے نہ کلیجہ میرا
آزماتا ہے مرے صبر کو مولا میرا

تم نے اٹھارہ برس کھینچے ہیں رنج و تعب
بانو پر خواہش تقدیر سے ناچار ہیں سب

اس کا میں کون ہوں تم کون ہو جو مرضی رب
زور کیا؟ جسکی امانت تھی وہ کرتا ہے طلب

اب نہیں جینے کی عمر اتنی ہی یہ لائے تھے
خلق میں داغ دکھانے کو ہمیں آتے تھے

شہ نے سمجھایا تو بانو نے کہا یہ رو کر
کیوں کمر کھولتی ہو غصہ سے صدقے مادر

ماں سے چلتے ہوئے آزردہ نہ جاؤ اکبر
خیر جو مرضی ہے اچھا کرو دنیا سے سفر

اب تو راضی ہوئے مادر سے میں واری بیٹا
آگے آؤ کہ بلائیں لوں تمہاری بیٹا

سن کے ماں سے یہ سخن قدموں پہ فرزند گرا
عرض کی آپ سے روٹھوں مرا مقدور ہی کیا

اس نے چھاتی سے لگا کر کہا صدقے بیٹا
جاؤ رخصت بھی کیا دودھ بھی تم کو بخشا

غم نہ کھانا کہ یہ ماں رو رو کے مر جائیگی

ساتھ دو باپ کا ماں کی بھی گذر جائے گی

کہکے یہ روئی جواں بیٹے کو چھاتی سے لگا
خاک پر سید سجاد نے سر دے ٹپکا

غل ہوا بانو نے دی مرنے کی اکبر کو رضا
رونے چلانے لگیں بہنیں کہ ہے ہے بھیا

کچھ زباں سے علی اصغرؑ جو نہ کہہ سکتا تھا
جھولے سے رو رو کے بھائی کی طرف تکتا تھا

کہتی تھی پیٹ کے سر زینبِ مضطر ہے ہے
بانو لوٹی گئی برباد ہوا گھر ہے ہے

نوجواں مرنے چلا بھائی کا دل بر ہے ہے
ہم سے پردیس میں چھوٹے علی اکبر ہے ہے

پاس کوئی نہیں تنہا شہِ مظلوم ہوئے
ہائے نانا کی زیارت سے بھی محروم ہوئے

چھوڑ کر روتا انہیں خیمے سے اکبر نکلے
پیچھے فرزند کے روتے ہوئے سرور نکلے

پر عجب حال سے ہمشکل پیمبر نکلے
مڑ کے تکتے تھے کہ خیمہ سے نہ مادر نکلے

ماں کے رونے کی جو کانوں میں صدا آتی تھی
ٹکڑے ہوتا تھا جگر چھاتی پھٹی جاتی تھی

در پہ موجود سواری کو جو تھا اسپ عقاب
جوڑ کر ہاتھ کہا شاہ سے با چشم پر آب

فدوی اسوار ہو لیجائیں جو تشریف جناب
بولے شہ تم چڑھو گھوڑے پہ میں تھامونگا رکاب

باپ نے پاؤں کو گر ہاتھ لگایا تو کیا
کاندھے پر چڑھتے تھے گھوڑے پہ چڑھایا تو کیا

مثال ۴ حضرت امام زین العابدینؑ اپنے بھائی علی اکبرؑ کو رخصت کر رہے ہیں۔ ؎

قصّہ سے کہا، کیا ہُوا؟ کیسی ہے یہ زاری
سر پیٹ کے وہ خادمۂ خاص پکاری
شبّیر اکیلے ہیں، غضب ہو گیا واری
اب جاتی ہے رَن کو علی اکبر کی سواری

ماں خاک اُڑاتی ہے، پھوپھی غش میں پڑی ہیں
سب بیبیاں حلقہ کئے گرد اُنکے کھڑی ہیں

فرمایا عصا لا کہ برادر سے مل آئیں
غازی سے مجاہد سے دلاور سے مل آئیں
دریائے شہادت کے شناور سے مل آئیں
شبّیر کے پیارے علی اکبر سے مل آئیں

بھائی کا نہیں کوچ یہ رخصت ہے نبی کی
ہم آپ چلیں گے کہ زیارت ہے نبی کی

فضّہ نے عصا دیکے جو بازو کو سنبھالا
بستر سے اُٹھا کانپکے وہ گیسوؤں والا
خم ہو گیا تھا، درد کمر سے قدِ والا
تھرّا کے پڑا پاؤں کہیں، اور کہیں ڈالا

اشک آنکھوں سے بہتے تھے گریبان قبا پر
ہر بار ٹھہر جاتے تھے سر رکھ کے عصا پر

آواز حزیں تھی کہ مری جان برادر
بیمار برادر، ترے قربان برادر
ہم آتے ہیں ٹھیرے رہو۔ اک آن برادر
ذی قدر برادر مرے ذی شان برادر

بھائی سے بغلگیر تو ہوتے ہوئے جاؤ
ہم روئیں تمہیں، تم ہمیں روتے ہوئے جاؤ

عابدؑ کی طرف دیکھ کے دوڑے علی اکبرؑ
آنکھوں کو ملا ہاتھوں سے قدموں پہ رکھا سر
سجّاد نے فرمایا کلیجے سے لگا کر
گردن میں مری ڈال دو باہوں کو برادر

شانے کے قریں زلف معنبر رہے بھائی

چہرہ مرے چہرے کی برابر ہے بھائی

اے روشنیِ خانۂ زہرا ترے صدقے
اے تشنہ لب اے بیکس و تنہا ترے صدقے
اے باپ کے عاشق ہمرے شیدا تری صدقے
اے رہرو فردوس معلّٰی ترے صدقے

گھر آج اُجڑتا ہے لُٹے جاتے ہیں بھائی
ہم قافلہ والوں سے چھُٹے جاتے ہیں بھائی

مثال ۵ حضرت امام حسینؑ بہن بیٹی اور بیوی سے رخصت ہوتے ہیں،

روتے ہوئے حرم میں گئے قبلۂ انام
تر تھی لہو سے لخت جگر کی قبا تمام
رُخ زرد دل میں درد بدن سرد تشنہ کام
طاقت نہ قلب میں نہ بدن میں لہو کا نام

یہ درد تھا بکا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے تھے
یہ حال تھا کہ رونے پہ دشمن بھی روتے تھے

پیارے نہ تھے حسینؑ علیہ السّلام کے
لائی حرم سرا میں بہن ہاتھ تھام کے
ٹھہرا رہے تھے پاؤں شہ تشنہ کام کے
سر دوش پر تھا زینبؑ عالی مقام کے

فرماتے تھے بہن علی اکبرؑ گذر گئے
ہم ایسے سخت جان تھے کہ ابتک نہ مر گئے

پرسا تمہیں شہید کا دینے کو آئے ہیں
کس کس کے داغ آج جگر پر اُٹھائے ہیں
بیٹے ہیں خاک اُڑائی ہے آنسو بہائے ہیں
یہ ہم تمہارے لال کے خون میں نہائے ہیں

سر تھا حسینؑ بیکس و تنہا کی گود میں
بیٹے کی جان نکلی ہے بابا کی گود میں

سر بار دوش ہے ہمیں رخصت کرو بہن
اب عنقریب خیمۂ عصمت میں تیغ زن

مُردے پڑے ہوئے ہیں عزیزوں کے بے کفن | پامال ہو نہ لاشۂ فرزند صف شکن

محجوب ہم ہیں فاسمؑ بے پر کی روح سے
شرمندگی نہ ہو علی اکبرؑ کی روح سے

یہ سُن کے بی بیوں کی جگر پر چھری چلی | زینبؑ زمیں پہ گر کے پکاری کہ یا علیؑ
سرِّ خفی جہاں کے ہیں سب آپ پر جلی | جاتا ہی سرکشوں میں یہ کونین کا ولی

بیکس کو آسرا ہے پسر کا نہ بھائی کا
آقا یہی تو وقت ہے مشکلکشائی کا

صدقے گئی پسر کے بچانے میں کد کرو | فرزندِ فاطمہؑ کی بلاؤں کو رد کرو
دریا کو چھین لو حق زہرا سند کرو | یا شیرِ حق مقام مدد ہے مدد کرو

پانی پہ جنگ آگ لگی ہے یہ دہر میں
حصّہ پسر کا کیا نہیں مادر کے مہر میں

یا مصطفےٰ[۲] اجلا میں بھیجا ہی تمہارا لال | یا شیرِ ذوالجلال دکھاؤ انہیں جلال
یا فاطمہ میں لٹتی ہوں بکھراؤ سر کے بال | یا رب اُلٹ دے آج یہ سب عرصۂ قتال

پھر کیا کسی سے کام ہی سب سے جدا رہوں
بھائی کو اپنے لے کے میں جنگل میں جا رہوں

فرمایا شہ نے صبر بہن چاہیئے تمہیں | خالق کی یاد سرّ و علن[۱] چاہیئے تمہیں
لب پر رضا رضا کا سخن چاہیئے تمہیں | جو ماں کا تھا چلن وہ چلن چاہیئے تمہیں

ہر بار پوچھتے تھے سبب آہ سرد کا
شکوہ کیا علیؑ سے نہ پہلو کے درد کا

[۱] یعنی پوشیدہ و ظاہر ۱۲

یہ سچ کہ تم کو مجھ سے محبت ہی اے بہن
کیا کیجے ناگزیر یہ فرقت ہی اے بہن
پیارے تمہارے بھائی کی خصمت ہی اے بہن
دنیا مقام رنج و مصیبت ہی اے بہن

بھولے نہ یاد حق کبھی گو حال غیر ہو
اُسکی ظفر ہے خاتمہ جس کا بخیر ہو

دیکھا یہ کہہ کے بالی سکینہ کو یاس سے
لپٹی وہ دوڑ کر شہ گردوں اساس سے
طاقت نہ تھی کلام کی ہر چند پیاس سے
بولی وہ تشنہ کام شہ حق شناس سے

کیا اِس بلا کے بَن سے تہیہ سفر کا ہے
صدقے گئی بتاؤ ارادہ کدھر کا ہے

فرمایا شہ نے ہاں سفر ناگزیر ہے
آؤ گلے لگو کہ یہ صحبت اخیر ہے
اب آرزوئے قرب خدائے قدیر ہے
تنہا ہیں ہم سپاہِ مخالف کثیر ہے

طے ہو یہ مرحلہ جو اعانت خدا کرے
جس کا نہ کوئی دوست ہو بی وہ کیا کرے

سُنکر مصیبت پدرِ بیکس و حزیں
بولی بلائیں باپ کی لیکر وہ مہ جبیں
نکلو بلا کے بَن سے کہیں یا امام دیں
آقا سوا حضور کے میرا کوئی نہیں

صدقے گئی مدینے چلو یا نجف چلو
للہ ساتھ لے لو مجھے جس طرف چلو

شہ نے کہا کہ بند ہیں راہیں پدر نثار
پھیلی ہوئی ہے چار طرف فوج نابکار
پیدل نکلنے پاتا ہے ناکون سی نہ سوار
اس دشت میں ہیں قید ہی احمد کا یادگار

قاصد جو میرے نام کا خط لیکے آتے ہیں

سر کاٹ کر درختوں میں لٹکائے جاتے ہیں

تم تو ہمارے چھوڑ گئے ہم کو جاں بلب
بی بی قدم پہ گر کے ہمیں کون روکے اب

للواریں چل گئیں بنے قاسمؑ پہ ہی سبب
مرزا شباب میں علی اکبرؑ کا ہے غضب

تھے جتنے زندگی کے حلاوت وہ چھٹ گئے
دو تین گھر بھرے ہوئے اک دم میں لٹ گئے

بی بی یہاں سے اہل وطن ہیں قریب تر
پر میری بیکسی کی نہیں ایک کو خبر

بھیجے ہیں شیعیان یمن نے بھی نامہ بر
لیکن حسینؑ تک نہ ہوا ایک کا گزر

قریوں سے بھی مدد کو جو نکلا وہ گھر گیا
لشکر بنی اسد کا قریب آ کے پھر گیا

کیا ایسے واسطے تجھے اس بن میں بیگناہ
تا مجھ تک آ سکے نہ کوئی میرا خیر خواہ

نہ دوست نہ عزیز نہ غمخوار نہ سپاہ
ہمراہی سب عدم میں وطن دور گھر تباہ

مجھ سا بھی کوئی بیکس و بے پر بشر نہ ہو
مر کر بہ دفن ہوں تو کسی کو خبر نہ ہو

جانا ہے دور شب کو جو آنا نہ ہو ادھر
ضد کر کے روئیو نہ ہمیں چاہتی ہو گر

پہلے پہل ہے آج شب فرقت پدر
سو رھیوں کی چھاتی پہ غربت سے کھا گئی

راحت کے دن گذر گئے یہ فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو جو یتیموں کا طور ہے

ننھے نے ہاتھ جوڑ کے بولی وہ تشنہ کام
بتلایئے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام

آنکھوں سے خون بہا کے یہ کہنے لگے امام
کھل جائیگا یہ درد الم تم پہ تا بہ شام

بی بی نہ پوچھو کچھ یہ مصیبت عظیم ہے
مر جائے جس کا باپ وہ بچہ یتیم ہے

بندے اُتارو طوق بڑھاؤ پدر نثار
چھپنا کہیں جو لوٹنے آئیں ستم شعار
چلائیو نہ آئیں آبی کہہ کے بار بار
دشمن ہمارے نام کا ہے شہر نابکار

لو الوداع جاتے ہیں اب قتل گاہ میں
سونپا تمہیں خداؤ نبیؐ کی پناہ میں

یہ کہہ کے پیاری بیٹی سی دیکھا ادھر ادھر
پوچھا کدھر ہیں بانو تے ناشاد نوحہ گر
فضہ نے عرض کی کہ ادھر پیٹتی ہیں سر
رخصت کی بھی حضور کے انکو نہیں خبر

لب پر گھڑی گھڑی علی اکبرؑ کا نام ہے
چلیے ذرا کہ کام اب اُن کا تمام ہے

رکھی قضا لاکے لاش پسر آپنے جہاں
مُنہ اُس زمیں پہ ملتی ہیں اور ہے لبوں پہ حال
کرتی ہیں اُٹھکے آہ تو ہلتا ہے آسماں
نعرہ یہ ہے کہ ہائے علی اکبرؑ جوان

واری گئے نہ قبر میں اماں کو گاڑ کے
جنگل بسا دیا مری بستی اُجاڑ کے

روتے ہوئے وہاں جو گئے شاہ خوشخصال
دیکھا کہ غش ہیں خاک پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
شبیہ بیٹھ کر یہ پکارے بصد ملال
اے شہر بانو ہوش میں آؤ یہ کیا ہے حال

سچ ہے فلک نے تم کو بڑے دکھ دکھائے ہیں
صاحب اُٹھو ہم آخری رخصت کو آئے ہیں

سنکر صدا حسینؑ کی چونکی وہ نوحہ گر
کی عرض سر جھکا کے قدم پر بچشم تر

تنہا حضور آئے ہیں باندھے ہوئے کمر
صاحب کہاں ہے منتوں والا امیر پسر

ایسے نہیں جو دُکھ میں جُدا ہوں جو باپ سے
اپنے مرادوں والے کو میں لونگی آپ سے

اے جان فاطمہ مرا پیارا کہاں گیا
اماں کی زندگی کا سہارا کہاں گیا
وہ تین دن کی پیاس کا مارا کہاں گیا
سیدانیوں کی آنکھوں کا تارا کہاں گیا

مرتی ہوں اپنے سر وہی قد کو دیکھ لوں
اک بار پھر شبیہ محمدؐ کو دیکھ لوں

وہ گورا گورا چاند سا مکھڑا دکھائیں پھر
لیلوں میں گیسوؤں کی بلائیں لوجائیں پھر
مجھ کو تو خیریت سے غرض ہی نہ آئیں پھر
خوشبو میں تن کی سونگھ لوں جنگل بسائیں پھر

تڑپے گا دل تو لیکے اجازت حضور سے
میں دیکھ لونگی در پہ کھڑی ہو کے دور سے

بیخود تھی میں جب آئے تھے میداں سے وہ ادھر
کیا دیکھتی مجھے تو کچھ آتا نہ تھا نظر
سنبھلا ذرا جو دل تو پھر ٹکنے لگا جگر
کب آئے کب گئے مجھے مطلق نہیں خبر

آئے تو چھپکے آئے گئے بے ملے ہوئے
باتیں نہ پیار کی ہوئیں نہ کچھ گلے ہوئے

گر میں خفا تو آئیں اُٹھ کر نثار ہوں
اُنکی خطا نہیں ہے میں تقصیر وار ہوں
دائی ہوں اُنکی آپکی خدمتگذار ہوں
اب رحم کیجئے کہ بہت بیقرار ہوں

تکلیف گرچہ ہوگی شہ مشرقین کو
لے آیئے منا کے مرے نورعین کو

بانو یہ سُن کے کہنے لگی شاہ بحر و بر
یارب جُدا نہ ہو کسی ماں سے جواں پسر
بانو کسے بلاؤں؟ کہاں ہیں وہ سیمبر
ہمشکل مصطفےٰ تو گئی فاطمہؑ کے گھر

ہر دُکھ میں صبر کرتے ہیں جو حق شناس ہیں
جس نے تمہیں دیا تھا وہ اب اُسکے پاس ہیں

جاگے ہوئے تھی رات کے نیند آگئی اُنہیں
ہے ہے منافقوں کی نظر کھا گئی اُنہیں
مخفی بہت کیا پہ اجل پا گئی اُنہیں
صحرائے کربلا کی فضا بھا گئی اُنہیں

زندہ نہ ہوگا لال اگر مر بھی جاؤ گی
اب تو کوئی گھڑی میں ہمیں بھی نہ پاؤ گی

جاتے ہیں ہم وہیں کہ جہاں ہے وہ لالہ فام
دیدو جو اپنے لال کو دینا ہو کچھ پیام
سُنکر یہ ذکر ہوش میں آئی وہ تشنہ کام
سمجھی کہ گھر تباہ ہوا اب چلے امام

خنجر سے حلق شاہ کے کٹنے کا طور ہے
بستی اُجڑ کے تخت اُلٹنے کا طور ہے

دامن پکڑ کے شاہ کا بولی وہ دلفگار
اے ابن فاطمہ یہ کنیز آپ کے نثار
بعد آپ کے جو لوٹنے آئیں ستم شعار
بیٹھے کہاں یہ بیکس و غمخوار سوگوار

کچھ حق میں اس کنیز کے فرما کے جایئے
صاحب کسی جگہ مجھے بٹھلا کے جایئے

میں وہ ہوں جو کہ قید میں آئی تھی یا امام
مشہور ہوں کنیز امام فلک مقام
پاس آپ کے ہے نانا کا اے قبلۂ انام
گر قید ہو گئی تو کہیں گی یہ خاص و عام

بندی چلی ہے شام کو آل رسولؐ کی

دیکھو یہی بہو ہے علی و بتول کی

فرمایا شہ نے حافظ و حامی ہے ذوالجلال
زینب کو دیکھو سر پہ نہ بھائی نہ دو نہ آل
زہرا کی بیٹیوں کی رہو تم شریک حال
صاحب تمہارے ساتھ ہے عابد سا خوشخصال

سجاد وارثوں کا وارث و والی الہ ہے
دیکھو دکھے نہ پاؤں کہ مشکل کی راہ ہے

والوداع لاش پہ بابا کے روئیو
لیکن نہ خاک اڑا کے تعلا کے روئیو
انو پہ سر کو شرم سے نیچا جھکا کے روئیو
قبر رسول پاک پہ ماں جا کے روئیو

کہتے ہیں صبر و شکر تباہی میں چاہیے
ارشاد کو خوف الٰہی میں چاہیے

مثال ۵ جب حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے بھائی عباس کے مرنیکی
سنکر رزمگاہ میں جاتے ہیں ؎

پاپہ سر برہنہ شہ بحر و بر چلے
صدمہ یہ تھا کہ ہاتھوں سے تھامے کمر چلے
منبھالے باپ کو یا چشم تر چلے
یہ بھی ادھر چلے شہ والا جدھر چلے

صدمہ ہے ضرب غم سے دل پاش پاش پر
روتے کو بھائی جاتا ہے بھائی کی لاش پر

تن یہ شاہ کی ہے کہ زلفوں پہ خاک ہے
آلودۂ غبار تمام روئے پاک ہے
لکھے لبوں پہ نالۂ روحی فداک ہے
اور زانکمر قبا کا گریبان چاک ہے

دست یسار بیٹے کی گردن میں ڈالے ہیں
شہ کو جھکے ہوئے علی اکبر سنبھالے ہیں

جب پاؤں کانپتے تھی تو کہتے تھی رو کے شاہ
طاقت بدن کی لیگئے عباسؑ آہ آہ

دریا نہ اتنا دور تھا اے میرے رشک ماہ
رستہ غلط کیا ہی کہ کچھ بڑھ گئی ہے راہ

ہے دوریاں سی یا مرا بھائی قریب ہے
کہتے ہیں، وہ "حضور! ترائی قریب ہے"

القصہ لائے باپ کو اکبر ترائی میں
زخمی ملا وہ شیر دلاور ترائی میں

پانی جو بوئے خون برادر ترائی میں
لاشے کے پاس گر پڑے سرور ترائی میں

گذری تھی عمر ہاتھ جسے جوڑتے ہوئے
دیکھا اُسی کو خاک پہ دم توڑتے ہوئے

مُنہ رکھکے مُنہ پہ بھائی کے دی بھائی نے صدا
اے شیر اے دلیر یہ بیکس ترے فدا

کیوں پتلیاں پھراتے ہو بھائی یہ کیا کیا
عباسؑ میں حسین ہوں دیکھو مجھے ذرا

میرا بھی حلق خشک ہی خنجر کے واسطے
بھائی کو چھوڑے جاتے ہو دم بھر کے واسطے

ٹھیرو عنان توسنِ عمرِ رواں نہ لو
ساتھی تھکا ہوا ہے رہِ کارواں نہ لو

کروٹ کراہ کر مرے آرام جاں نہ لو
لگتی ہی چوٹ دل پہ مرے ہچکیاں نہ لو

مرجاؤں گا میں ساتھ اگر چھوٹ جائے گا
بھائی مرا تو رشتۂ جاں ٹوٹ جائے گا

بولے یہ آنکھ کھول کے عباس نامدار
آقا نثار جان گرامی ترے نثار

یہ موت زندگی ہے نہ ہے فخر و افتخار
نکلے جو گل کے سامنے بلبل کی جان زار

دیدار دیکھنے میں نہ آتا تو موت تھی

پروانہ شمع کو جو نہ پاتا تو موت تھی

زانوئے پاک نورِ خدا اور سر حقیر
ذرّے کو مہر کر دیا اے آسماں سریر

عالم کا بادشاہ کجا اور کجا حقیر
تکیہ کسی کو بھی یہ ملا ہے دمِ اخیر

پایا یہ اوج ماں کی نہ بابا کی گود میں
معراج مل گئی شہِ والا کی گود میں

رحمت نے رُخ کیا مری جانب حضور آئے
روشن ہو کیوں نہ چشم جو خالق کا نور آئے

لیکر رسول جامِ شراب طہور آئے
ایسا نہ ہو سرور جو بالین پہ حور آئے

عشّاق مر بھی جاتے ہیں زخمی بھی ہوتے ہیں
میں اب تندرست ہوں کیوں آپ روتے ہیں

شہ نے کہا کہ لینے کو آئے ہیں تم کو سب
سر خاک پر ٹپک کے یہ بولا وہ جانِ لب

عبّاس چھوڑ جاؤ گے اب ہم کو ہی غضب
اے جانِ فاطمہ جگر سیّدِ عرب

کس کس کو روکئے کہ یہ اعدا کے ریلے ہیں
صدمہ بڑا یہی ہے کہ حضرت اکیلے ہیں

راحت کی راہ ہے سفر گلشنِ ارم
تا تک تو کب کے مر گئے ہوتے تڑپ کے ہم

صدمہ مگر ہے روح پہ اے قبلۂ امم
اُلفت یہ آپ کی ہے کہ اٹکا ہوا ہے دم

دنیا سے کوچ کرنے کو جی چاہتا نہیں
اب بھائی جان مرنے کو جی چاہتا نہیں

کہہ کے چپ ہو گئے تھے کہ اُٹھا جگر میں درد
رُخسار سُرخ سُرخ جو تھے ہو گئے وہ زرد

کی کروٹیں تو بھر گئی زخموں میں رن کی گرد
مُنہ رکھ کے شہ کی پاؤں پہ کھینچی اک آہ سرد

دنیا سے انتقال علمدار ہو گیا
سارا فوج بیکس و بے یار ہو گیا

بھائی کے آگے بھائی تڑپ کر جو مر گیا
صدمہ غضب کا سب نبی پر گذر گیا

خنجر الم کا دل سے جگر تک اتر گیا
چلاتے تھے کہ تیر ہمارا ادھر گیا

لیتے تھے بوسے جھک کے تن پاش پاش کے
اٹھا اٹھا کے گرد پھیرتے تھے بھائی کی لاش کے

جھک کر لپٹ گئے تھے کہ جیتا صدا رہو
سر رکھ لو میرے زانو پہ گردن ذرا اٹھاؤ

تم بن یہ تم کو ملتی ہیں بھیگے کدر پہ جاؤ
کب سے بلک رہی ہے سکینہ نہ دیکھ آؤ

باتوں میں پیار کی کہیں تم سے گلا نہ ہو
دریا پہ سو گئے ہو سکینہ خفا نہ ہو

کیا ہی جو آنکھ بند کئے ہو چچا سے تم
کیا کچھ خفا ہو بعد رسول خدا سے تم

اکثر ہمیں بچاتے تھے لوؤں میں ہوا سے تم
ہم اٹ گئی ہیں گرد تو جھاڑو ردا سے تم

ہے دوپہر کا وقت برادر پہ دھوپ ہے
سایہ کرو علم کا مرے سر پہ دھوپ ہے

اکبر نے رو کے عرض یہ کی اے شہ زمان
رونے سے اب ملینگے نہ حضرت کو بھائی جان

لے چلئے گھر میں لاش علمدار نوجوان
ایسا نہ ہو نکل پڑیں خیمے سے بی بیاں

دریا پہ ننگے سر کہیں بنت علی نہ آئے
فضہ کو ساتھ لے کے سکینہ چلی نہ آئے

اکبر نے عرض کی کہ چلیں اب شہ زماں
رو کے امام دین نے کہا جائیں اب کہاں

یاں بھی مرے لئے وہی رونا ہے جو یہاں
اپنا بھی گھر ہے اب وہی بھائی رہی جہاں

اُٹھتے نہ تھے حسین برادر کو چھوڑ کر
رکھا پسر نے پاؤں پہ سر ہاتھ جوڑ کر

نسوانہ کھڑی تھی خیمہ کے باہر جو بے خبر
حضرت کو اُس نے دور سے دیکھا برہنہ سر

پردہ اُلٹ کے خیمہ کا بولی وہ نوحہ گر
سیدانیو اُٹھو علم آتا ہے خوں میں تر

اکبر علم لیے ہیں علی کا نشاں نہیں
کوتل فرس تو آتا ہے وہ نوجواں نہیں

ناگاہ سب کو دور سے آیا نظر نشاں
تھا خاک سے بھرا ہوا وہ جلوہ گر نشاں

گویا کہ تھا شبیہ الم سر بسر نشاں
ڈوبا تھا خوں سے پنجۂ پُر نور اور نشاں

چھُپ جاتا تھا پھریرے میں یوں کانپ کانپ کے
رونا ہی جس طرح کوئی مُنہ ڈھانپ ڈھانپ کے

سمجھے یہ سب کہ بازوئے عباس کٹ گئے
سیدانیوں کے غم سے لہو اور گھٹ گئے

بچوں کے ننھے ننھے جگر غم سے پھٹ گئے
رنگ اُڑ گئے رخوں سے کلیجے اُلٹ گئے

ہر دل پہ برق رنج و غم و یاس گر پڑی
بچوں سمیت زوجۂ عباس گر پڑی

اکبر علم کو خیمے کے اندر جھکا کے لائے
سر اپنا پیٹتے ہوئے گھر میں حسین آئے

چلاتے تھے کہ بھائی کو بھائی کہاں سے پائے
عاشق نے ساتھ چھوڑ دیا ہائے ہائے

چھینا اجل نے ہم کو ہمارے دلیر کو
لوٹی بیوا ترائی میں رو آئے شیر کو

لپٹی تو تھی علم سے سکینہ جگر فگار
ہے ہے علی کی لال کی رانڈوں میں تھی پکار

پرچم پہ یوں لچکتا تھا پنجہ وہ بار بار
سر پیٹے جس طرح کوئی مظلوم سوگوار

تصویر حسرت و الم و یاس بن گیا
رایت بھی نخل ماتم عباسؑ بن گیا

زیر علم تھا زوجۂ عباسؑ کا یہ حال
مانگ بھر اتھا خاک سے بکھرے ہوئے تھے بال

چلاتی تھی کہ اے اسد کبریا کے لال
میں سر کو پیٹتی ہوں نہیں کچھ نہیں خیال

جاتا ہے یوں جہاں سے کوئی آنکھ موڑ کے
مسکن کیا ترائی ہیں لونڈی کو چھوڑ کے

پرخون علم کے پاس تھے عباسؑ کے پسر
تکمے کھلے تھے کرتوں کے تھرّاتے تھے جگر

ماں نے جو طوق تارے تھے اور کان کی گہر
سہما ہوا تھا ایک تو اک پیٹتا تھا سر

زلفوں پہ گرد تھی تو رخوں پر غبار تھا
چہروں سے درد بے پدری آشکار تھا

پھوپھی پہ شہ سے کہتا تھا آنسو بہا بہا
بابا ہمارے گھر میں کب آئینگے اے چچا

آیا علم پر اُن کے نہ آنے کی وجہ کیا
چھوٹے سے رو کے تب یہ بڑے بھائی نے کہا

اماں کی مانگ اُجڑ گئی صدمے گذر گئے
بھیا تمہیں خبر نہیں بابا تو مر گئے

دوڑا یہ سُن کے نہر کی جانب وہ بے پدر
رو کر پکارے شاہ کو بیٹا۔ چلے کدھر

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولا وہ نوحہ گر
بابا کی لاش اُٹھانیکو جاتے ہیں نہر پر

ہمّت نہ اُٹھ سکے گی تو خالی نہ آئیں گے

دامن میں ہم کٹے ہوئے ہاتھوں کو لائینگے

مثال ۶، علی اکبرؑ نزع کی حالت میں ہیں امام حسین علیہ السلام اُن کے پاس جاتے ہیں ؎

جسدم سُنی حسینؑ نے یہ جانگزا صدا
صابر اگرچہ تھے پہ کلیجا اُلٹ گیا
ہاتھوں سے دل کو تھام کے دوڑے برہنہ پا
نعرہ کیا کہ اے علی اکبرؑ کروں میں کیا

مل کر غریب بیکس و تنہا سے جائیو
آئے ضعیف باپ تو دنیا سے جائیو

ہے ہے مرے شفیق پسر مہرباں پسر
خورشید پسر سعید پسر قدرداں پسر
مادر کا چین باپ کا آرام جاں پسر
کم گو پسر شہید پسر نوجواں پسر

مقتل کدہر ہے کوئی بتاتا نہیں مجھے
اے نورعین کچھ نظر آتا نہیں مجھے

مجھ کو غریب دشت بلا کہہ کے پھر پکار
اک بار یا ثنہ و سہ ا کہہ کے پھر پکار
اے شبر سید الشہدا کہہ کے پھر پکار
صدقے ہو باپ یا ابتا کہہ کے پھر پکار

میری بھی جان تن سے ترے ساتھ جائیگی
مرجاؤں گا یہیں جو نہ آواز آئے گی

کچھ ہوش دست و پا کا نہیں بجز اس کے
زخمی ہے قلب کشتۂ اندوہ و یاس ہوں
غمگین ہوں مردہ دل ہوں حزیں ہوں اداس ہوں
دم توڑتم تو ہے غضب اور میں پاس ہوں

کیونکر قرار آئے دل ناصبور کو
لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے آنکھوں کے نور کو

دوڑے یہ بات کہہ کے جو سلطان بحر و بر
بیٹے کی لاش باپ نے دیکھی لہو میں تر
اُٹھایہ دل میں درد کہ خم ہوگئی کمر
دیکھا جو خم منہ کے قریب آگیا جگر
تڑپے جو گر کے اور تڑپ کر ٹھہر گئے
غُل پڑ گیا صفوں میں کہ شبیرؑ مر گئے

ہوش آیا تین ساعتِ کامل کے بعد جب
دیکھا کہ مٹ رہی ہے شبیہ رسولؐ رب
آنسو بہا کے رکھ دیئے بیٹے کی لب پہ لب
چلاتے تھے کہ چھوڑ چلے ہم کو ہی غضب
دل سے گلے لپٹنے کی حسرت نکال دو
باہیں اُٹھا کے باپ کی گردن میں ڈال دو

اکبرؑ نے آنکھیں کھول کے دیکھا رخِ پدر
گالوں پہ اشک آنکھوں سے ٹپکے ادھر ادھر
فرمایا شہ نے زانو پہ رکھ کر کے سر پسر
روتے ہو کس کیواسطے اے غیرتِ قمر
یاں سے اُٹھا کے آل پیمبر میں لے چلیں
غم ماں کا ہے تو آؤ تمہیں گھر میں لے چلیں

کی عرض مہلت اتنی کہاں آشہ امم
اب کیجیے قبلہ رو کہ نکلتا ہی تن سے دم
دولت ملی کہ دیکھ لئے آپ کے قدم
غیر از غمِ فراق مجھے کچھ نہیں ہے غم
ساتھ آئے تھے جو چاہنے والے وہ دور ہیں
رونا ہوں اسلئے کہ اکیلے حضور ہیں

شہ نے کہا مرے لئے بیٹا نہ رو بس
ہوگا یہاں سے جانے میں تھوڑا سا پیش و پس
دنیا کی آرزو ہے نہ جینے کی کچھ ہوس
میرے لئے ہے اب دمِ خنجر ہر اک نفس
اکبرؑ ترے الم سے جگر چاک چاک ہے

جب تو نہ ہو تو باپ کے جینے پہ خاک ہے

یہ بات سُن کے لینے لگا ہچکیاں پسر
سُوکھی زبان دکھائی کہ پیاسا ہوں اے پدر

زردی اجل کی چھا گئی چہرے پہ سر بسر
دو بار لی کراہ کے کروٹ اِدھر اُدھر

دنیا سے انتقال ہوا نورِ عین کا
ہنگام ظہر تھا کہ لُٹا گھر حسینؑ کا

نکلی اِدھر تو جسم سے اکبرؑ کی جان زار
یاں بیبیاں ہوئیں در خیمہ پہ بیقرار

فضہ پکاری بُوڑھی سی بڑھ کر یہ ایکبار
اکبرؑ پہ کیا گذر گئی اے شاہ نامدار

چھُریاں غم و الم کی کلیجے پہ چلتی ہیں
جلد آیئے کہ حضرتِ زینبؑ نکلتی ہیں

گھبرا کے شاہ دیں نے اُٹھائی کپہ کی لاش
لپٹائے تھے کلیجے سے لختِ جگر کی لاش

لائے قریبِ خیمہ جو اُس سیمبر کی لاش
غُل پڑ گیا کہ آتی ہے رشکِ قمر کی لاش

زہراؑ کی بیٹیاں جو کھلے سر نکل پڑیں
سب بیبیاں خیام سے باہر نکل پڑیں

سر ننگے شہ کے گرد تھیں سیدانیاں تمام
ننھے بیچ میں شہید کا لاشہ لئے امام

بانو پکارتی تھی کہ یا شاہِ تشنہ کام
جیتا ہے یا جہاں سے گیا میرا لالہ فام

مُنکا ڈھلا ہے ہونٹوں پہ سوکھی زبان ہے
اے جانِ فاطمہؑ مرے بچے میں جان ہے

زینبؑ تڑپ تڑپ کے یہ کہتی تھی بار بار
یہ لاش میری گود میں دیجئے بہن نثار

طاقت نہیں ہے آپ میں یا شاہ نامدار
صدقے گئی لرزتا ہے فاقوں سے جسم زار

شہ کہتے تھے یہ کام ہے مجھ خستہ جان کا
تجھ سے بہن اُٹھے گا نہ لاشہ جوان کا

لاشہ پسر کا خیمہ میں لائے امام پاک
مسند رسول حق کی بچھائی بر روئے خاک

شہ نے لٹا کے لاش جو کی آہ و درد ناک
دل بی بیوں کے ہو گئے سینے میں چاک چاک

پہلے گماں تھا غش میں دغا کر کے آئے ہیں
آخر یقین سب کو ہوا مر کے آئے ہیں

لاشے کے پاس ہاتے پسر کہہ کے آں گری
ہاتھوں سے دل پکڑ کے پھوپھی نیم جاں گری

دل پر ہر اک کے برق غم نوجواں گری
غش ہو کے واں گری کوئی اور کوئی واں گری

چھوٹی بہن جو لاشے سے آ کر لپٹ گئی
اک حشر ہو گیا صف ماتم اُلٹ گئی

مثال ۷، حضرت علی اکبرؑ زخمی کی حالت میں امام حسین علیہ السلام کو پکارتے ہیں اور وہ بدحواس قتل گاہ کیطرف جاتے ہیں۔ اسوقت اضطرابی حرکات، اور باپ بیٹے کی گفتگو ۵

سُن کر یہ استغاثۂ فرزند خوشخصال
سیّد نے آہ کی کہ ہلا فرش ذوالجلال

کھولے جناب فاطمہؑ کی بی بیوں نے بال
بانو پکاری خیر تو ہے اے علیؑ کے لال

ہے ہے پسر سے کونسی مادر بچھڑ گئی
صاحب بتاؤ کیا مری بستی اُجڑ گئی

نیزے سے کس کے لال کا زخمی ہوا جگر
کرتے ہیں کس کی لاش کو پامال اہل شر

کہتا ہے کون رن میں تڑپ کر پدر پدر
اب گھر سے بن نکلتی ہوں ہے ہے مرا پسر

پردہ نہ مجھ سے کیجئے سب جانتی ہوں میں

آواز یہ اُسی کی ہے پہچانتی ہوں میں

بانو کو تسمیں دے کے چلے شاہ نامدار
وہ پیاس اور وہ دھوپ کا صدمہ وہ اضطرار
دل تھا اُلٹ پلٹ تو کلیجہ تھا بیقرار
اُٹھتے تھے اور زمین پہ گرتے تھے بار بار

چلاتے تھے شبیہ پیمبر ہم آتے ہیں
گھبرائیو نہ اے علی اکبرؑ ہم آتے ہیں

آؤں کدھر کو اے علی اکبرؑ جواب دو
چلا رہی ہے ڈیوڑھی پہ مادر جواب دو
اکبرؑ برائے خالق اکبر جواب دو
بیٹا جواب دو مرے دلبر جواب دو

گرتے ہیں ہم ثواب کا ہاتھوں سے کام لو
بیٹا ضعیف باپ کے بازو کو تھام لو

کچھ سوجھتا نہیں ہیں کدھر جاؤں کیا کروں
اے نورِ چشم تجھ کو کہاں پاؤں کیا کروں
مضطر ہے جان و دل کسے سمجھاؤں کیا کروں
کیونکر تجھے کو ڈھونڈ کے میں لاؤں کیا کروں

پایا تھا مدتوں میں جسے خاک چھان کے
وہ لعل ہم نے کھو دیا جنگل میں آن کے

بس اب خبر حسینؑ کی لے جلد اے اجل
اے جسم زار زیست کا باقی نہیں محل
اے جان ناتواں، دلِ مجروح سے نکل
ہاں اے نفس چھری کی طرح سی گلے پہ چل

چھوٹے نہ ساتھ اُس کا جو پیری کی آس ہو
لاشہ بھی لاشۂ علی اکبرؑ کے پاس ہو

جنگل سے بے حواس پھرے نہر پر گئے
واں بھی جو وہ گہر نہ ملا سوئے بر گئے
دوڑے کسی طرف تو کسی جا ٹھہر گئے
تھا لے ملی لہو کے برابر جدھر گئے

ٹپکا ہوا زمین پہ جگر کا لہو ملا
لیکن کہیں نہ وہ پسرِ ماہرو ملا

جا کر صفوں کے پاس پکارے بہ اشک و آہ
ہے کس طرف مرے علی اکبرؑ کی قتل گاہ
اے ظالموں یہ شب ہے کہ دن ہو گیا سیاہ
کس ابر میں چھپا ہے مرا چودھویں کا ماہ

بتلاؤ اں جان ہے کہ نہیں جسم زار میں
زخمی پڑا ہے شیر مرا کس کچھار میں

لاشِ پسر کو ڈھونڈھتے تھے شاہ بحر و بر
سر پیٹنے کی جا ہے کہ ہنستے تھے اہلِ شر
کہتا تھا ہاشمی اے پسر سید البشر
کس کو حضور ڈھونڈتے ہیں مر گیا پسر

خود ڈھونڈھ لیجیے جسدِ پاش پاش کو
بتلائیں گے نہ ہم علی اکبرؑ کی لاش کو

یہ سُن کے کھینچ لی شہ والا نے ذوالفقار
چمکی جو برق تیغ تو بھاگے ستم شعار
شہ کو نظر پڑا علی اکبرؑ کا رہوار
چلائے اے عقاب کدھر ہے ترا سوار

دکھلا دے مجھ کو لاش میرے نورِ عین کی
کس دشت میں پڑی ہے بضاعت حسینؑ کی

ملنے دے ان رکابوں کے حلقوں سے چشمِ نم
ہے ہے اسی میں تھے مرے فرزند کے قدم
بوسے تری رکاب کے لوں اے اسیرِ غم
اکبرؑ کے ہاتھ میں تھی یہی باگ ہے ستم

ہے ہے وہ ہاتھ پاؤں مرے آفتاب کے
قربان تیری لگام کے صدقے رکاب کے

گھوڑے نے ہنہنا کے سوئے دشت کی نظر
یعنی کہ لاش آپ کے پیارے کی ہے اِدھر

جاتا ہے آگے آگے وہ تازی بچشم تر
گھوڑے کے پیچھے پیچھے تھی سلطان بحر و بر

جنگل میں لاشۂ پسر نوجوان ملا
وہ ماہ تقا ملا تو مگر نیم جان ملا

دیکھی عجیب حالت فرزند نوجوان
پیکاں گلے میں ہونٹوں پہ نکلی ہوئی زبان
تن پہ جراحت تبر و خنجر سنان
گردن تھی کج، پھری ہوئی آنکھیں تھیں آسماں

ٹاپوں سے مرکبوں کے جراحت پھٹے ہوئے
چہرہ سفید خاک میں گیسو اٹے ہوئے

ہچکی کیساتھ کہتے ہیں واکر کے چشم تر
اے جان جسم زار میں اور ایک دم ٹھہر
اے موت بی وطن کی جوانی پہ رحم کر
اے درد تھم ذرا کہ پھٹا جاتا ہے جگر

پھر ایک بار سید والا کو دیکھ لوں
مہلت بس اتنی دے کہ میں بابا کو دیکھ لوں

دشمن کو بھی نہ بیٹے کا لاشہ خدا دکھائے
حضرت زمیں پہ گر کے پکارے کہ ہائے ہائے
زندہ رہے یہ پیر جوان جہاں سے جائے
اے لال تین روز کے فاقے پہ زخم کھائے

شاید جگر کے زخم سے تم بیقرار ہو
زخمی تمہاری چھاتی پہ بابا نثار ہو

کیوں کھینچتے ہو پاؤں کو اے میرے گلعذار
کیوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے پٹکتے ہو بار بار
آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہے بیقرار
بیٹا تمہاری ماں کو تمہارا ہے انتظار

بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں
آبر تمہاری ماں جیئے گی فراق میں

غش میں سنا جو میں علی اکبرؑ نے ان کا نام
کس یاس کی نگاہ سے دیکھا سوئے امام
سوکھی زبان دکھا کے یہ بولا وہ تشنہ کام
شدت یہ پیاس کی ہے کہ دشوار ہے کلام
اب اور کوئی دم کا پسر میہمان ہے
امداد یا حسینؑ کہ پانی میں جان ہے

فرمایا شہ نے اے علی اکبرؑ میں کیا کروں
پانی نہیں ہے مجھ کو میسّر میں کیا کروں
گھیرے ہیں نہر کو سنگر میں کیا کروں
کچھ بس نہیں مرا مرے دلبر میں کیا کروں
اعدا نہ دیں گے بوند اگر لاکھ کر کریں
بیٹا تمہاری ساقی کوثر مدد کریں

حضرت یہ کہنے تھے کہ چلا حلق سے پسر
اتنی زبان ہلی کہ خدا حافظ اے پدر
ہچکی جو آئی تھام لیا ہاتھ سے جگر
انگڑائی لے کے رکھ دیا شہ کے قدم پہ سر
آباد گھر لٹا شہ والا کے سامنے
بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

لکھتا ہے ایک راوی غمگین و پُر ملال
یعنی ادھر ہوا علی اکبرؑ کا انتقال
نکلی حرم سے ایک دن فاطمہ جمال
گویا جناب سیّدہ کھولے ہوئے تھیں بال
تھی اس طرح سے رُخ پہ ضیا اس جناب کے
حلقہ ہو جیسے نور کا گرد آفتاب کے

چلاتی تھی ارے مرا پیارا ہے کس طرف
اے آسماں وہ عرش کا تارا ہے کس طرف
اے ابر شام چاند ہمارا ہے کس طرف
اے ارض کربلا وہ سدھارا ہے کس طرف
ہے ہے سنان لے جان گئی میہمان کی

میت کدھر کو ہے مرے کڑیل جوان کی

اے مرے لمبے گیسوؤں والے کدھر ہے تو
ہے ہے مرے غریبی کے پالے کدھر ہے تو
واری تجھے کہاں لگے بھالے کدھر ہے تو
کینو کر پھوپھی جگر کو سنبھالے کدھر ہے تو

اٹھارواں برس تھا کہ موت آگئی تجھے
اے نورِ عین کس کی نظر کھا گئی تجھے

ہے ہے مرے سعید و رشید و متین جواں
خوشرو جوان غریب جوان مہ جبین جوان
صفدر جواں شکیل جواں نازنین جواں
کس نے تجھے مروڑ لیا اے حسین جواں

آغاز تھیں مسیں ابھی ایسے مُسن نہ تھے
بچے مرے ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے

بہ بین کرتی جاتی تھی وہ سوختہ جگر
سید انیوں کا غول تھا پیچھے برہنہ سر
جاتی تھی بیچواس ادھر سے وہ نوحہ گر
آئے اُدھر سے لاش لئے شاہ بحر و بر

دیکھا لہو رواں جو تن پاش پاش سے
سب بیبیاں لپٹ گئیں اکبرؑ کی لاش سے

مناظرِ قدرت

عربی اور فارسی میں مناظرِ قدرت پر بہت کم لکھا گیا ہے، اور اردو میں تو گویا سرے سے اُس کا وجود ہی نہ تھا، میر ضمیر نے سب سے پہلے اس پر طبع آزمائی کی، لیکن وہ مضمون بندی اور استعارات کو کلام کا اصلی جوہر سمجھتے تھے اس لئے اصلی حالت نہ ادا کر سکے، میر انیس نے اس صنف پر اگرچہ

صرف دو تین مرثیے لکھے ہیں، لیکن جو کچھ لکھا ہے، کمال درجہ تک پہنچا دیا ہے،

صبح کا سماں

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
ہونے لگا اُفق سے ہویدا نشانِ صبح

گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سُو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

خورشید نے جو رُخ سے اُٹھائی نقابِ شب
در کھل گیا سحر کا، ہوا بندِ بابِ شب

انجم کی فرد فرد سے لیکر حسابِ شب
دفتر کُشائے صبح نے اُلٹی کتابِ شب

گردوں پہ رنگِ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے نہاں
جُوں بے چمن ہے پھولوں کو جس طرح باغباں

آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں
مُرجھا کے رہ گئے ثمر و شاخ کہکشاں

دکھلائے طور، بادِ سحر نے سموم کے
پُژمردہ ہو کے، رہ گئے غُنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور

وہ رونق اور وہ سرد ہوا، وہ فضا وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو، اور قلب کو سرور

انساں زبیں محو، ملک آسمان پر
جاری تھا، ذکرِ قدرتِ حق، ہر زبان پر

وہ سُرخی شفق کی اُدھر چرخ پر بہار
وہ بار ور درخت، وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کی وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہُوا دامان کوہسار

نافے کھلے ہوئے، وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

تھی دشت کربلا کی زمیں رشک آسماں
تھا دور دور تک شب مہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستاروں کا ذرّوں پہ تھا گماں
نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں

سرسبز جو درخت تھا وہ نخل طور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح
گلزار شب خزاں ہوا آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح
سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزار صبح

تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دمبدم
مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں یہ نہ زیادہ بہت نہ کم

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہُوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہُوا

وہ صبح نور اور وہ صحرا وہ سبزہ زار
تھے طائروں کے غول درختوں پہ بیشمار
چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار
کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار

واتھے دریچے باغ بہشت نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں
تھا جسکی ضو سے وجد میں طاؤس آسماں
ذرّوں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں
نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں

ہر نخل پر ضیائے سر کوہ طور تھی
گویا فلک سے بارش باراں نور تھی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد
مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد
یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پرہ نہ گرد

دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

ایک اور موقع پر بھی یہی سماں باندھتے ہیں ؎

وہ صبح اور وہ چھاؤں شاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے آدنی گوی اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور

گلشن خجل تھے، وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا، پھولوں کی وہ مہک
ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا، وہ فضا
وہ جوش گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا

دراج و لبلک، ہدہد و لمائوس کی صدا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا

پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
نھالے بھی نخل کے بسد گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار

پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے زیب گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم

کوکو کا شور، نالۂ حق سرہ کی دھوم
جاری تھے وہ جو انکی عبادت کی تھی رسوم

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی بھی بار بار
یاحی و یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار

اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
تسبیح تھی کہیں، کہیں تہلیل کردگار

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

گرمی کا سماں گرمی کا سماں شعرائے فارس نے باندھا ہے لیکن نہایت مبالغہ اور دور از کار خیالات سے کام لیا ہے۔ طالب آملی کا ایک قصیدہ ہے جس قصیدہ کی تشبیب، گرمی کے بیان سے شروع کیا ہے ؎

چناں بخار زمیں تیرہ ساخت آب لال — کہ قطرہ بر لب جوئے کند نیابت خال
ہوائے مہر تفسیدگی چناں گردید — کہ شعلہ راز نسیم است بیم اضمحلال

مرزا صاحب ایک قصیدہ میں گرمی کی شدت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

نیست ایں فوارہ ہر سو جلوہ گر در عرصہ ہا — کردہ است از تشنگی بیروں زباں خلقے آب

ایک اور شاعر نے فرضی توجیہ خوب کی ہے ؎

گرد باد، از پے آں می جہد از جاہ کہ راہ — پائے می سوزدش از بسکہ زمیں شد سوزاں

میر انیس بھی، اگرچہ رواجِ عام کے اثر سے، بیچرل حالت سے، جا بجا تجاوز کر گئے ہیں تاہم اُن کا اصلی جوہر بھی نمایاں ہے، ؎

وہ لوں، وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب — کالا تھا، رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب — خیمے جو تھی حبابوں کے، تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا، دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر — خسخانہ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں، کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار — ایک ایک نخل جل رہا تھا، صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل، نہ لہکتا تھا سبزہ زار — کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ بار دار

گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
تپتے بھی مثل چہرۂ مدفوق زرد تھے

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ مُنہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا، جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا، شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر ایک موج کی زباں
تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تپ کی تاب
چھپنے کو برق چاہتا تھا دامن سحاب
سب سے سوا تھا، گرم مزاجوں کو اضطراب
کافور صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب

بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اسیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

جو لوگ کہتے ہیں کہ میر انیس کے ہاں خیال آفرینی اور مضمون بندی نہیں ہے وہ ان اشعار میں سے اُن شعروں کو دیکھیں، جہاں تخیل حالت سے ہٹ کر مبالغہ اور تکلف پیدا ہو گیا ہے،

منظر

یعنی سین

کسی خاص واقعہ یا کسی خاص حالت کی تصویر کھینچنا جسکو انگریزی میں سین کہتے ہیں، واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے،

عام واقعہ نگاری اور سین میں یہ فرق ہے کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ بخلاف اسکے سین اسکی کیفیت کا نام ہے جو متعدد واقعات یا واقعہ کے متعدد جزئیات کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے مثلاً اس شعر میں ؎

لو چلتی ہے خاک اُڑتی ہے ہے ظہر کا ہنگام	تنہا پہ چلی آتی ہے اُمنڈی سیہ شام

لو کا چلنا۔ خاک کا اُڑنا۔ ظہر کا وقت ہونا۔ فوجوں کا اُمنڈنا۔ ہر چیز کو الگ الگ لیا جائے تو واقعہ ہے، اور اُن سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو سین ہے میر انیس نے شاعری کے اس صنف کو جس کمال تک پہنچایا اُردو کیا فارسی میں بھی اسکی بہت کم مثالیں ملتی ہیں، ہم چند مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مثال ۱ حُر نزع کی حالت میں ہے، امام حسین علیہ السلام اُسکے سرہانے موجود ہیں۔ نزع کی حالت اُس وقت کی حالت اور گفتگو ؎

قبلہ رو کیجئے لاشہ مرا اے قبلہ دیں	پڑھیے یٰسین کہ اب ہے یہ دم بازپسیں
کوچ نزدیک ہے اے بادشہِ عرش نشیں	لیجئے تن سے نکلتی ہے مری جان حزیں
بات بھی اب نہ زباں سے نہیں کیجاتی ہے	
کچھ اڑھا دیجئے مولا مجھے نیند آتی ہے	

کہہ کے یہ گود میں شبیر کے لی انگڑائی
آیا ماتھے پہ عرق، چہرہ پہ زردی چھائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے اے بھائی
چل بسے حُرّ جری پھر نہ کچھ آواز آئی

طائر روح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہ والا کی طرف

مثال ۲ - گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت
پانی نہ منزلوں، نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں غازیوں کے رخت
سونا لگے ہیں رنگ جوانان نیک بخت

راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
تو نے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کو کوئی کرتا نہیں سفر
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنج مسافرت میں ہیں سلطان بحر و بر
لب برگ گل سے خشک ہیں چہرے عرق میں تر

اٹھتی ہے خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

اہل حرم ہیں ہودج و محمل میں بیقرار
معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ اے شاہ نامدار
گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفل شیر خوار

کیونکر یہ دکھ اٹھے چھ مہینہ کی جان سے
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے

چلاتی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہدو اب کہیں خیمہ کریں بپا
ٹھنڈی ہوا میں لے کے چلو تم پہ میں فدا

سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

مثال ۳۲، صغیر السن بچہ نزع کی حالت میں

راوی نے یہ لکھا ہے کہ اسدم بحال زار
لائے حسین ہاتھوں پہ اک طفل شیر خوار

دن کو ہوا اقران مہ و مہر آشکار
مرجھا گیا تھا پیاس سے لیکن وگلعذار

تھا فرط غش سے ننھا سا منکا ڈھلا ہوا
باندھے ہوئے تھا مٹھیاں اور منہ کھلا ہوا

چھوٹا سا ایک سبز عمامہ تھا دوش پر
ہاتھا جھنڈولے بالوں میں ہالے میں جوں قمر

جٹی بھویں وہ جن پہ تصدق دل پدر
آنکھیں تو نرگسی پہ نقاہت زیادہ تر

سایہ میں دامن خلف بو تراب کے
رخسار تھے کہ پھول کھلے تھے گلاب کے

پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل ادھر ادھر
خشکیدہ ہونٹھا موئے مژہ آنسوؤں سے تر

باچھوں سے تھا نمود جے دودھ کا اثر
ہاتھوں میں نیلے ڈورے تھے ہیکل تھی سینہ پر

ننھے سے دل کو ماں کے بچھڑنے کا درد تھا
رن کی ہوائے گرم سے جسم اس کا سرد تھا

کرتا بدن میں آتا تھا اس رنگ سے نظر
پڑتی ہے اوس پھولوں پہ جیسے دم سحر

سینہ تھا صاف صورت آئینہ جلوہ گر
گرمی سے ہو گیا تھا شلوکہ عرق میں تر

چھاتی میں دمبدم جو دم اس کا اٹکتا تھا
گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو دے دے پٹکتا تھا

مثال ۴ - فوجوں کی آمد و جنگ کی تیاری

ہے ہے شور آمد آمد فوج فلک سریر
فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہے بہیر

دعوت کیو اسطے ہیں سنانیں لئے شریر
حضرت کی پیشکش کو کمانیں ہیں اور تیر

پانی پہ چوکیاں ستم آرا بٹھاتے ہیں
دریا کے گھاٹ برچھیوں سے روکے جاتے ہیں

شقے گئے ہیں شام کے حاکم کے جا بجا
ہر پرگنہ سے ہے طلب لشکر چغا

آکر اُترتی جاتی ہیں فوجیں جُدا جُدا
لیتا ہے جائزہ عمر و سعد بے حیا

غُل ہے کرینگے قتل جو زہرا کے ماہ کو
انعام میں ملیگا دو ماہہ سپاہ کو

تیغیں سلاح خانے سے نکلی ہیں بیشمار
ہے جا بجا درستی اسباب کا رزار

ہوتے ہیں لیس تیروں کے دستے کئی ہزار
خنجر ہے ہیں فیج کو پیاسوں کے آبدار

نوکیں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر
پھل برچھیوں پہ چڑھتے ہیں پرچم نشان پر

نقارۂ دغا پہ لگی چوب، یک بیک
اُٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگے فلک

شہپور کی صدا سے ہراساں ہے یہ ملک
قرنا پھنکی کہ گونج اُٹھا دشت یک بیک

شور دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

حد سے فزوں تھی کثرت افواج نابکار
نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ تھی تیغ آبدار

ہر سمت تھی سناں سناں مثل خارزار
ہر صف میں تھی سپر پہ سپر مثل لالہ زار

پیکاں بہم تھے جیسے ہوں مُل کے کھلے ہوئے
گوشوں سے بندھے کمانوں کے چلّے ملے ہوئے

اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل
تھے برچھیوں کی صورتِ مقراض پھل پہ پھل
خنجر وہ جن کی آب میں ہے تلخیِ اجل
وہ گرز جنکے ڈر سے گرے دیو سر کے بل

وہ دو تبر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے بچھے ہوئے حلقے کمند کے

مثال ۵ - سفر کی تیاری

آراستہ ہیں بہرِ سفر، سر و قبا پوش
عمامے سر پہ ہیں، عبائیں ہیں بر دوش
یارانِ وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش
حیران کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش

مُنہ ملتا ہے رو کر کوئی سرور کی قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبرؑ کے قدم پر

ہمسنوں کی عباس کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ — اب آنکھوں سے چھپ جائیگی تصویرِ یداللہ
وداعی ملاقات کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسمؑ کی ہوا خواہ — واللہ دلوں پر ہے عجب صدمہ جانکاہ

ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
یہ اُنس پہ خلقِ حسنی کون کریگا

سفر کی تیاری اور سواری کی تقسیم
روتے ہیں وہ جو عونؑ و محمدؑ کے ہیں ہمسن — کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن
اس داغ سے چین آئے ہمیں یہ نہیں ممکن — گرمی کا مہینہ ہے، سفر کے یہ نہیں دن

تم حضرتِ شبیرؑ کے سایہ میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اُٹھانے کو چلے ہو

ہمجولیوں سے کہتے ہیں وہ دونوں برادر ۔۔۔ ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیونکر ۔۔۔ مامور ہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر

وہ دن ہو کہ ہم حق غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

رخصت کیلئے لوگ چلے آتے ہیں پیہم ۔۔۔ ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پُرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم ۔۔۔ غل ہے کہ چلا دلبر مخدومۂ عالم

خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبر نبیؐ کے
روضہ پہ اُداسی ہے رسولِ عربیؐ کے

تدبیر سفر میں ہے اُدھر سبط پیمبرؐ ۔۔۔ گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباس دلاور ۔۔۔ تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبرؑ

شہ کو جنہیں لیجانا ہے وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہُوا اصطبل چلے آتے ہیں گھوڑے

حاضر درِ دولت پہ ہیں سب یار و انصار ۔۔۔ کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتیار
ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار ۔۔۔ چلاتے ہیں دربان کوئی آتے نہ خبردار

ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قنائیں لئے فراش کھڑے ہیں

عورتیں کیونکر رخصت ہوتی ہیں۔

عورات محلہ چلی آتی ہیں بصد غم ۔۔۔ کہتی ہیں یہ دن رحلتِ زہراؑ سے نہیں کم
رسے کی طرح رونے کا غل ہوتا ہے ہر دم ۔۔۔ فرش اُٹھتا ہے کیا پچھتی ہے گویا صف ماتم

غل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہے زینبؑ

ہر اک کے گلے ملتی ہے اور روتی ہے زینبؑ

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر
اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتی ہیں شبیر
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر
مسلم کا خط آئے تو کریں کوچ کی تدبیر

عورتوں کا سمجھانا کہ یہ سفر کے دن نہیں

للہ ابھی قبر پیمبرؐ کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہؑ زہراؑ کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

اجڑے گا مدینہ جو یہ گھر ہوئیگا خالی
برباد ی یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی
کیا جانیں کہ پھر آئیں نہ آئیں شہ عالی
حضرت کے سوا کون ہے اس شہر کا والی

زہراؑ ہے نہ حیدرؑ نہ پیمبرؐ نہ حسنؑ ہیں
اب اُنکی جگہ آپ ہیں یا شاہ زمن ہیں

گرمی کے یہ دن اور پہاڑوں کا سفر آہ
ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں کبھی آگاہ
ان کو تو نہ لے جائیں سفر میں شہ ذی جاہ

قطرہ بھی دم تشنہ دہانی نہیں ملتا
کوسوں ملک اس راہ میں پانی نہیں ملتا

منہ دیکھ کے اصغرؑ کا چلا آتا ہے رونا
آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا
لکھا تھا اسی سن میں مسافر نہیں ہونا

کیا ہوگا جو میدان میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کمھلائیں گے ماتھا تھ ملے گی

اُن بی بیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر
بہنوں یہیں یثرب سے لئی جاتی ہے تقدیر
اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر
یہ خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیرؑ

مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

مثال ۶ ۔ گرمی اور گرمی کی شدت میں زن و مرد اور بچوں کی حالت

گرمی کی شدت

مخفی تھے شرر شدتِ گرما سے حجر میں
چلتی تھی یہ لوں آگ بھڑکتی تھی جگر میں
نہ بحر میں راحت تھی کسی دل کو نہ بر میں
جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ پتے تھے شجر میں

پایاب تھے گرمی سے دریا جو بڑے تھے
سوتیں بھی نہ آتی تھیں کنوئیں خشک پڑے تھے

پتھر کی چٹانوں سے نکلتے تھے شرارے
ناری تھی ہوا، سبز شجر زرد تھے سارے
ڈوبے تھے عرق میں اسد اللہ کے پیارے
دھڑکا تھا کہ یہ لوں کسی بچے کو نہ مارے

ہوش آتا نہ تھا اصغرِ معصوم کو غش سے
اودے تھے لبِ لعل سکینہ کے عطش سے

گرمی کی شدت سے ایک ایک شخص کی حالت

تھا مہر کی حدت سے یہ حال شہ ابرار
ماتھے سے ٹپکتا تھا عرق سُرخ تھے رخسار
تحمید میں جنباں تھے لبِ لعل گہربار
بھر کر نفسِ سرد یہ فرماتے تھے ہر بار

اک پھول بھی زہرا کے چمن میں نہ ملیگا
کیا ہوگا جو پانی کسی تن میں نہ ملے گا

گرمی سے یہ تھا حضرتِ عباس کا عالم
مُنہ سُرخ تھا اور ہانپتے تھے صورتِ ضیغم
چہرہ بھی عرق ناک تھا، اور طبع بھی برہم
فرماتے تھے اشک آنکھ میں بھر کر شہِ عالم

تم سیر رہو راحت تمہیں بھائی نہ ملے گی
جب تک کسی دریا کی ترائی نہ ملے گی

یوں اکبرِ مہرو تھے پسینہ میں نہائے
جیسے تپِ محرق میں جواں کو عرق آئے

جب پھکنے لگا دل تو سخن لب پہ یہ لائے
ربِّ دو جہاں حشر کی گرمی سے بچائے

گذرے گا ہر اک دم تپش دل سے قلق میں
سب تا بہ کمر ڈوبے ہوئے ہونگے عرق میں

حضرت کو سکینہؑ یہ صدا دیتی تھی پیہم
محمل میں گھٹا جاتا ہے اگرمی سے مرا دم

سب ڈوب گئی ہوں یہ پسینے کا ہے عالم
برسے گی یوں ہی آگ تو جینے کی نہیں ہم

ہیں ابر کرم آپ کرم کیجئے بابا
سایہ کہیں مل جائے تو دم لیجئے بابا

سُنکر یہ بھتیجی کی صدا حضرتِ عباسؑ
کہتے تھے چچا صدقے ہو، رو دو نہ بصد یاس

لو پانی پیو تم کو لگی ہو جو بہت پیاس
دم گھٹتا ہے محمل میں تو آجاؤ مرے پاس

تکلیف تمہاری ہمیں منظور نہیں ہے
دن ڈھلتا ہے منزل بھی بس اب دور نہیں ہے

مشکیں لئے سقّے جو سواری کے تھے ہمراہ
بھر لاتے تھے پانی پے فوج شہِ ذی جاہ

جس طرح کہ پیاسوں کا ہو مجمع بہ سرِ راہ
پانی پہ گرے پڑتے تھے یوں شہ کے ہوا خواہ

جنگل میں عطش کا جو تھا صدمہ کہ دمہ پر
چہرے پہ چھڑکتا تھا کوئی کوئی نرہ پر

گرمی سے بچنے کی تدبیریں

بھرتا تھا دمِ سرد، پریشان کوئی ہو کے
دامن سے ہوا دیتا تھا منہ کو کوئی دھو کے

بچتا تھا کوئی لو سے، رو چہرے پہ رو کے
رکھ لیتا تھا سر پر کوئی رومال بھگو کے

پڑتی تھیں جو چھینٹیں تو مزہ دیتا تھا پانی

جھک کر کوئی چلو ہی سے پی لیتا تھا پانی

کہتے تھے قرین ناقوں کے اکر شہِ ابرار
حاضر ہے جو پانی کسی بی بی کو ہو درکار
آندھی ہے گھٹا ٹوپ اُڑے جاتے ہیں ہر بار
اے بنتِ یداللہ سکینہ سے خبردار

رستا یہ پہاڑوں کا ہے منزل یہ کڑی ہے
بچوں کو چھپائے رہو لوں آج بڑی ہے

محمل سے نظر کر کے یداللہ کی جائی
کہتی تھی کہ اللہ نے یہ شکل دکھائی
جسدن سے چھٹا گھر کہیں راحت نہیں پائی
فریاد بہن دھوپ میں سو نلا گئے بھائی

کیا بن گئی جنگل میں امام دوسرا پر
سایہ بھی درختوں کا نہیں ظلِ ہما پر

صدقے گئی جنگل کی نہ اب دھوپ میں چلیئے
دن کاٹیئے سایہ میں کہیں رات کو چلیئے
منہ دھوئیئے دم لیجئے پوشاک بدلیئے
لو چلتی ہے آفت کی پہاڑوں سے نکلیئے

ناشاد بہن آپ کی غربت پہ فدا ہو
بچہ کوئی گر تونس کے مر جائے تو کیا ہو

سرِ مثال ۷ ۔ لڑائی کی تیاری ۔

طبل جنگ بجنے پر شجاعوں کی کیا حالت ہوتی ہے

یہ ذکر تھا کہ بجنے لگا طبل اس طرف
مشکل کشا کی فوج نے باندھی ادھر بھی صف
تیروں نے رُخ کیا سوئے ابنِ شہِ نجف
سینوں کو غازیوں نے ادھر کو دیا ہدف

تھا بسکہ شوقِ جنگ ہر اک رشکِ ماہ کو
جوش آگیا دغا کا حسینی سپاہ کو

غصے سے آفتاب ہوئے مہوشوں کے رنگ
فوجوں پہ جا پڑیں یہ دلوں کو ہوئی امنگ

تن تن کے برچھیاں جو سنبھالیں برائے جنگ
بیچین ہو گئے فرس ابلق و سرنگ

پاسِ ادب سے شاہ کی، صف بڑھ کے تھم گئی
پڑتی ہر اک سوار کی گھوڑے پہ جم گئی

سنتا ہے بڑھا کوئی قبضہ کو چوم کے
بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے

بولا کوئی یہ غول ہیں کیا شام و روم کے
ٹکڑے اڑائیں گے مگر دشمن شوم کے

نامرد جو ہیں آنکھ چراتے ہیں مرد سے
دونوں کو پیار کر کے پھریں گے نبرد سے

دو لاکھ سے نظر کسی غازی کی لڑ گئی
بل کھا کے زلفِ خم پہ کسی کے اکڑ گئی

چتون کسی کی شورِ دہل سے بگڑ گئی
منہ سرخ ہو گیا، شکن ابرو پہ پڑ گئی

نکلا کوئی سمند و رانوں میں داب کے
غصے سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے

بڑھ کر کسی نے تیر ملایا کمان سے
نیزہ کوئی ہلانے لگا آن بان سے

نعرہ کسی کا پار ہوا آسمان سے
تلوار کھینچ لی کسی صفدر نے میان سے

اک شور تھا کہ تلخ کیا ہے حیات کو
لاشوں سے پٹ گیا دو نہر فرات کو

سنتے ہی یہ کلام جوانانِ نامور
لڑکے الگ کھڑے ہوئے غول اپنا باندھ کر

کہتے تھے نیچے لیتے وہ غیرت قمر
یارب شکست کو فیول کو دے، اور ہیں ظفر

سر کے نہ پھر وغا میں جو بڑھ کے قدم گڑے
جا کر درِ یزید پہ اپنا علم گڑے

مثال ۸ - بیکسی اور تنہائی -

حضرت پہ ادھر ہوتی ہے اعدا کی چڑھائی
تنہا ہیں نہ بیٹا نہ بھتیجا ہے نہ بھائی
سیدانیاں دیتی ہیں محمدؐ کی دوہائی
اعدا میں یہ غل ہے کہ کرو فتح لڑائی

ڈوبے ہوئے خوں میں شہدا گرد پڑے ہیں
گھوڑے پہ اکیلے شہ ابرار کھڑے ہیں

ہے تابشِ رُخ سے عرق افشاں خ گلفام
لب خشک ہیں پانی کا میسر نہیں اک جام
لوں چلتی ہے خاک اڑتی ہی ہے ظہر کا ہنگام
تنہا پہ چلی آتی ہے اُمنڈی سیہ شام

یہ شوق شہادت ہے شہنشاہ زمن کو
بوچھاڑ سے تیروں کے بچاتے نہیں تن کو

ہیں آگ میں تیغوں کے کھڑے نہیں کچھ غم
اُمت پہ نہ آنچ آئے دعا ہی یہی ہر دم
ہیں گرد بیاباں میں اے گیسوئے پُرخم
نیلے ہیں لب لعل پہ ہے پیاس کا عالم

بو آتی ہے دریا سے برادر کے لہو کی
چھینٹیں ہیں قبا پر علی اکبرؑ کے لہو کی

ذکرِ غمِ عباسؑ بھی اصلا نہیں کرتے
غیرت سے نظر جانبِ دریا نہیں کرتے
خونِ علی اکبرؑ کا بھی دعوی نہیں کرتے
اُمت کے یہ ہیں ظلم پہ شکوا نہیں کرتے

پانی کے بھی طالب نہیں گو تشنہ دہن ہیں
کلمے ہیں نصیحت کے محبت کے سخن ہیں

مثال ۹ - فوج کا داخلہ اور تیاری جنگ

خیمہ میں اُترے یا نہ شہ عرش بارگاہ
آ آ کے اُس طرف بھی اُترنے لگی سپاہ

کوسوں علم کھلے تھے جدھر کیجیے نگاہ
یاں تک کہ بند ہو گئی چاروں طرف سے راہ

فوجوں سے تا بہ صبح زمیں رن کی بھر گئی
اک رات میں چڑھی ہوئی ندی اُتر گئی

اس کثرتِ سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم
آپہنچا شام سے پسرِ سعد نحس و شوم

جسکی جلو میں لاکھ سواروں کا ہے ہجوم
اکثر ہیں یکہ تاز جوانانِ شام و روم

بس کھل گیا نہ طورِ صفائی کا ہوئے گا
اب کل سے بندوبست لڑائی کا ہوئے گا

یہ ذکر تھا کہ دُور سے ظاہر ہوئے نشاں
امڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بیکراں

موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں
لہراتے تھے ہوا سے علم مثلِ بادباں

ہلتا تھا دشت کیں دلِ اس طرح بجتے تھے
باجوں کا شور یہ تھا کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل
خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل

مکّار و اہلِ نار و دغا باز و پُر دغل
شکلیں مہیب جیسے سے قد، ابرُوں پہ بل

بدخواہِ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلواریں کھینچے بڑھ کے جمے دو طرف سوار
غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایکبار

ڈنکے کی دمبدم تھی صدا آسمان کے پار
"آگے بڑھے چلو" یہ نقیبوں کی تھی پکار

گھوڑوں کے گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زرّیں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

مثال ۱۰ حضرت عباسؑ نہر سے مشک بھر چکے ہیں اور واپس آنا چاہتے ہیں، دشمن یہ دیکھ کر ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں حضرت عباسؑ اس کشمکش میں ہیں کہ آپ کو بچائیں یا مشک کو سنبھالیں اُس وقت کے مضطربانہ حرکات کی تصویر ؎

اک تشنہ کام لاکھوں میں کس کس کو دے جواب
شل ہو گیا تھا بازوئے فرزند بوتراب
کہتا تھا ہاتھ اُٹھنے کی مجھ میں نہیں ہے تاب
لڑنے میں فکر تھی کہ نہ ضائع ہو مشک آب

پروانہ تھی جو بازوؤں پر تیر کھاتے تھے
لیکن سپر سے مشک سکینہؑ بچاتے تھے

برچھی سے چھد گیا کبھی دل اور جگر کبھی
اک شیر سے اِدھر کبھی جھپٹے اُدھر کبھی
چھاتی تلے تھی مشک کبھی دوش پر کبھی
سینہ کبھی تھا مشک کے اوپر سپر کبھی

رہوار پر سنبھلتے تھے جب جھوم جھوم کے
روتے تھے بازوؤں کو علیؑ چوم چوم کے

تکتے تھے مسکرا کے سوئے آسماں کبھی
ہونٹوں پہ پھیر لیتے تھے سوکھی زبان کبھی
لگتا تھا تن پہ تیر کبھی اور سناں کبھی
جھکتے تھے خود فرس سے کبھی اور نشان کبھی

گھوڑے کو جب بڑھاتے رکابوں میں دبا کے
قدموں سے نکلے جاتے تھے حلقے رکاب کے

چھینٹیں لہو کی اُڑ کے جو پڑتی تھیں مشک پر
دامن سے پونچھتے تھے علمدار نامور
پاس تھا کہ تیغوں سے ٹکڑے ہو میرا سر
شقہ مگر علم کا لہو سے نہ ہوئے تر

اقبال بادشاہ زمین و زماں رہے

دنیا میں ہیں رہوں نہ رہوں یہ نشاں رہے

گر کر کبھی اُٹھے؟ کبھی رکھا زمیں پہ سر
اُبلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر
عترت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر
کروٹ کبھی تڑپ کے اِدھر لی کبھی اُدھر

اُٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کی پھل گرے
تیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بل گرے

مثال ۱۱ ۔ پردہ کا اہتمام ۔

بیت الشرف خاص سے نکلے شہ ابرار
روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار
پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار

باہر حرم آتے ہیں رسولِ دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکوں کی ہوا سے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اتر جائے
آتا ہوا دھر جو وہ اس جا پہ ٹھہر جائے
ناقہ پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے

مریمؑ سے سوا حق نے شرف اُنکو دیئے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں

آ پہنچی جو ناقہ کے قریں دخترِ حیدر
خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھا سبط پیمبر
فضہ نو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر
تھے پردۂ محمل کو اُٹھائے علی اکبرؑ

فرزند کمر بستہ چپ و راس کھڑے تھے
نعلین اُٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

مثال ۱۲ ۔ مستورات کا محمل سے اترنا ۔

جنازہ زینبؑ جو قریب ڈیوڑھی کے پہنچا
کرسی سے اُٹھے آپ شہِ یثرب بطحا

گرد آ کے کیا قاسمؑ و عباسؑ نے پردا
محمل سے اُترنے جو لگی دختر زہراؑ

اک ہاتھ علی اکبر ذی جاہ نے تھاما
اک ہاتھ جگر بند یداللہ نے تھاما

چھاتی سے سکینہ کو لگائے ہوئے اُتریں
آنسو رخِ انور پہ بہائے ہوئے اُتریں

شہزادی کو چادر میں چھپائے ہوئے اُتریں
پردہ تھا مگر سر کو جھکائے ہوئے اُتریں

مثال ۱۳ - عونؑ و محمدؑ میدان جنگ میں لڑ رہے ہیں، سیدانیاں دروازہ پر بدحواس کھڑی ہیں، حضرت زینبؑ، فضہ سے پوچھتی ہیں کہ میرے بچے کیا کر رہے ہیں وہ جواب دیتی ہیں ؎

سیدانیاں دروازہ پہ تھیں کھولے ہوئے سر
اصغرؑ کو لیئے کانپتی تھی بانوئے بر پر

فضہ تھی پریشان کئے موجیمہ کے اندر
پردہ سے لگی کہتی تھی یہ شاہ کی دختر

بتلا مجھے بچے مرے کیا کرتے ہیں دونوں
وہ کہتی تھی لاکھوں سے دغا کرتے ہیں دونوں

وہ رخ پہ نظر آتے ہیں، اُڑتے ہوئے گیسو
وہ میمنے بجلی کی طرح کرتے ہیں ہر سو

ڈھالیں لیئے وہ بھاگتے پھرتے ہیں جفا جو
وہ ابر میں چھپ چھپ کے نکل آتے ہیں ہر سو

بہتا ہے لہو چھاتیوں سے چور ہیں دونوں
کس طرح پکاروں کہ بہت دور ہیں دونوں

مثال ۱۴ - حضرت عباسؑ نہر کے کنارے پہنچے ہیں گھوڑا کئی دن کا پیاسا تھا پانی دیکھ کر بیتاب ہو گیا ہے، لیکن چونکہ تمام قافلہ پیاسا ہے

حضرت عباسؑ اس کو پانی پینے سے روکتے ہیں۔ اس وقت گھوڑے کی حالت ؎

دو دن سے بیزباں جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند

ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند
چمکا رہے تھے حضرت عباسؑ ارجمند

تڑپا تا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

مثال ۱۵ حضرت امام حسین علیہ السلام کا میدان کربلا میں داخلہ رفقائے خطاب اور نوجوانوں کی سیر و تفریح ؎

آتر ایہ کہہ کے کشتی اُمت کا ناخدا
جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا

حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا
دیکھو تو کیا ترائی ہے ہے کیا نہر ہے کیا فضا

اکبرؑ شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہ سربلند
کیوں آج مقام ہے تمہیں شاید بہت پسند

کی مسکرا کے عرض کہ اے شاہ ارجمند
بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند

شیراب یہیں رہینگے عنایت جو رب کی ہے
میں کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام
گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہ تمام

انجم کی طرح گرد تھے حیدر کے لالہ فام
شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام

زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے

لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ تھے

مثال ۱۶ ۔ تمام رفقا کی شہادت کے بعد حضرت امام حسینؑ کی بیکسی اور دشمنوں کا نرغہ۔

مونسو خانہ زہرا پہ تباہی ہے آج — گھر پہ سادات کے پانی کی تباہی ہے آج
بن تنہا خلفِ شیرِ الٰہی ہے آج — خلق سے بسطِ نبیؐ خلد کو راہی ہے آج

قتل کی بیکسیِ مظلوم کی تدبیریں ہیں
اک نبیؐ زادہ ہے اور سینکڑوں شمشیریں ہیں

یزے تانے ہوئے آندھی سے چلے آتے ہیں سوار — ہیں علمدار پہ یلغار دھرے تیس ہزار
تیغیں کھینچے ہوئے چوگرد کھڑے ہیں جو سوار — غل ہے مہلت نہ ملے سبطِ نبیؐ زینہار

برقِ شمشیر ہر اک جا پہ چمک جاتی ہے
جس طرف دیکھتے ہیں موت نظر آتی ہے

نہ ہے غمخوار نہ ہمدرد نہ یار کوئی — نہ بھتیجا ہے نہ بیٹا نہ برادر کوئی
نہیں اتنا ہے خبر پوچھے جو آکر کوئی — ایک اللہ تو ہے اور نہیں مددگار کوئی

تھے جو غمخوار وہ رینی پہ پڑے سوتے ہیں
اپنی تنہائی پہ شاہِ دو جہاں روتے ہیں

جسم پر تیغ لگاتا ہے کوئی اور کوئی تیر — خوں میں سر تا بہ قدم تر ہیں جناب شبیرؑ
رو کے فرماتے ہیں اعدا سے کہ اے قومِ شریر — کیا گناہ ہے مجھے کیوں مارتے ہے تقصیر

یوں نہ گھبراؤ نہ کہ میں مرگ پہ آمادہ ہوں
رحم لازم ہے کہ سید ہوں نبیؐ زادہ ہوں

کوئی سنتا نہیں فریاد امامِ عالی — برچھیاں چلتی ہیں اور ہوتے ہیں ترکش خالی

ماہ زہرا پہ فلک نے یہ مصیبت ڈالی
خوں میں تر زلفیں ہیں یا نک ہے پریشاں حالی

زخم تلواروں کے خاموش کھڑے کھاتے ہیں
غش میں جھکتے ہیں کبھی گاہ سنبھل جاتے ہیں

لاشۂ اکبرؑ و عباسؑ جو آتا ہے نظر
تھام لیتے ہیں کلیجہ کبھی اور گاہ جگر

رو کے فرماتے ہیں بیٹے سے کہ اے جان پدر
ایسے غافل ہو کہ لیتے نہیں بابا کی خبر

مرے پیارے مرے جائے مرے لہر اٹھو
ہم پہ تنہائی ہے اٹھو علی اکبرؑ اٹھو

لاش عباسؑ سے کرتے ہیں یہ فریاد بیاں
اے مرے یار وفادار مرے شیر جواں

وقت امداد و اعانت ہے برادر قربان
چھوڑ کر ہم کو لعینوں میں سدھارے ہو کہاں

لاکھ ملعونوں نے میداں میں ہمیں گھیرا ہے
تم نے بھائی سے عجب وقت میں منہ پھیرا ہے

کہتے تھے اہل ستم حال سناتے ہو کسے
مر گئے اکبرؑ و عباسؑ بلاتے ہو کسے

کون ہے بیکس و مظلوم دکھاتے ہو کسے
چونکتے ہیں کہیں مردے بھی جگاتے ہو کسے

حلق پر خنجر خونخوار پھرا دیتے ہیں
اب تمہیں بھی یاسی مقتل میں گرا دیتے ہیں

رو کے فرماتے ہیں یہ فوج ستمگار سے شاہ
ذبح ہونیکی عید ہی خالق ہے گواہ

غم میں اپنوں کے میں کیونکر نہ کروں نالہ و آہ
اُن کو روؤں گا میں جبتک کہ جیوں گا واللہ

بھولتا ہے کوئی اس طرح کے غمخواروں کو
یاد کرتے ہیں وفادار وفاداروں کو

دشت میں جلتی ہیں لوؤں دھوپ کی شدت ہے غضب
بیٹھے ہیں پیاسے کے یاں ہیں اور وقت زوال

سرخ ہے خوں سے قبا دھوپ سے رخسار ہے لال
نکلی آتی ہے زباں منہ سے یہ ہے پیاس کا حال

تن جلا جاتا ہے جب گرم ہوا آتی ہے
ریت اڑ اڑ کے ہر اک زخم میں بھر جاتی ہے

تیر بیٹھا ہے جو اس چاند سی پیشانی پر
خوں کی چادر سی ہے اک چہرۂ نورانی پر

ہے عجب بیکسی اس فاطمہؑ کے جانی پر
کبھی اعدا پہ نظر ہے تو کبھی پانی پر

تیغیں کھا کھا کے لبِ خشک جو دکھلاتے ہیں
تیر ادھر سے عوض جرعۂ آب آتے ہیں

جوں کماں کٹ کے لٹک آئی ہیں ابرو خمدار
ہیں لہو رونے سے وہ نرگسی آنکھیں گلنار

بوسے جن ہونٹوں کے لیتے تھے رسولِ مختار
پیاس سے سوکھ گئے ہیں وہ لبِ گوہر بار

چاند سا منہ تھا جبیں پھول سے رخساروں سے
چاک ہیں مثلِ کتاں ظلم کی تلواروں سے

زخمی ہیں ابنِ یداللہ کے دونوں بازو
ہاتھ ہیں ہاتھ کہ یکدست ہیں اب بے قابو

تیغ شانے پہ کبھی لگتی ہے ساعد پہ کبھو
انگلیاں ایسی ہیں زخمی کہ ٹپکتا ہے لہو

پر یہ ہے امتِ محبوبِ خدا کی خاطر
زخمی ہاتھوں کو اٹھائے ہیں دعا کی خاطر

سخت آفت میں ہے وہ پشت و پناہِ عالم
کمرِ پاک ہے بارِ غمِ عباسؑ سے خم

علی اکبرؑ کی جوانی کا ہے جانکاہ الم
زانو پر مارتے ہیں دستِ تاسف ہر دم

وار سے تیغوں کے اعضا کے بدن کٹتے ہیں

کھیت سے پر کہیں شیروں کے قدم ہٹتے ہیں

ساتھ اسوار کے زخمی ہے سراپا ہر وار
کتی سو تیر میں گردن سے بھی پہلو سے بھی پار

یال سے خون کی بوندیں ہیں ٹپکتی ہر بار
نہ کھڑے رہنے کی طاقت ہے نہ تاب رفتار

تیر جب لگتا ہے کچھ کہہ تو نہیں سکتا ہے
پھیر کر منہ شہ والا کی طرف تکتا ہے

شاہ فرماتے ہیں اے میرے رفیق و ہمدم
ہے مجھے اپنے عزیزوں کے برابر ترا غم

ہم سے تو چھٹتا ہے اب تجھ سے جدا ہوتے ہیں ہم
مر کے بھی تجھ کو نہ بھولوں گا یہ کھاتا ہوں قسم

خلق سے سوئے عدم کوچ کی تیاری ہے
آخری اب تیرے آقا کی یہ اسواری ہے

دیکھ لے تیری طرح میں بھی ہوں زخمی واللہ
فاقہ مجھ پر بھی ہے اور تو بھی ہے بے دانہ و کاہ

ہے اگر تشنہ دہانی سے ترا حال تباہ
تین دن گذرے ہیں پانی سے نہیں میرا بھی نباہ

گو زباں خشک جو منہ پھیر کے دکھلاتا ہے
پر ساقی کو ثر کو حجاب آتا ہے

مثال ۱۷ - اس بیت کو ایک دوسرے موقع پر دکھایا ہے **۵**

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے
ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے

اس طرف لشکر اعدا میں صف آرائی ہے
یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے

برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو ہے شور ستمگاروں میں

زخمی بازو ہیں کہ خم ہے بدن میں نہ تب ہے
ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہے قدموں سے رکاب

پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں پُرآب
تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کو جواب

شدتِ ضعف میں جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سینکڑوں تیر ستم تن سے گذر جاتے ہیں

گیسو آلودۂ خوں لپٹے ہیں رخساروں سے
شانے کٹ کٹ کے لٹک آئے ہیں تلواروں سے
تیر پیوست ہیں خوں بہتا ہے سو فاروں سے
لاکھ آفت میں ہے اک جان دل آزاروں سے

فکر ہے سجدۂ معبود میں سر دینے کی
وار سے تیغوں کے فرصت نہیں دم لینے کی

خوں میں تر پیچ عمامے کی ہیں سر زخمی ہے
ہے جبیں چاند سی پُرنور مگر زخمی ہے
سینہ سب برچھیوں سے تا بہ کمر زخمی ہے
تیر بیداد سے دل زخمی جگر زخمی ہے

ضربِ شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آکر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے
مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے
بند آنکھیں ہیں سر پاک جھکا جاتا ہے

گرد ز سر او علیؑ گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امام دو جہاں گرتے ہیں

گرتے ہیں قطرۂ خوں زخم جبیں سے پیہم
دستِ مجروح سے کچھ پونچھ سکتے نہیں تیر ستم
فکر ہے بخشش اُمت کی کچھ اپنا نہیں غم
کرتے ہیں حمد خدا خشک زباں سے ہر دم

ہے عبا تیروں سے غربال قبا گلگلوں ہے
ہونٹ یاقوت سے زخمی ہیں دہن پر خوں ہے

زیں سے ہوتا ہے جدا دوش محمدؐ کا کیں
چمنِ فاطمہؑ کا سرو ہے مائل بہ زمیں

برچھیاں گرد ہیں اور بیچ میں سرور دیں
ہے یہ نزدیک کہ ٹوٹے کمرِ نبوت کا نگیں

پاؤں ہر بار رکابوں سے نکل جاتے ہیں
یا علی کہتی ہے زینبؑ تو سنبھل جاتے ہیں

لاکھ شمشیریں ہیں اور ایک تنِ اطہر ہے
ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے

سینکڑوں خنجرِ فولاد ہیں اور اک سر ہے
نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے

باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اٹھا سکتے نہیں
سامنے اہلِ حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں

کوئی سیّد کا نہیں آہ بچانے والا
ضربے لاکھوں ہیں اور اک زخم اٹھانے والا

پیاس ہیں کوئی نہیں پانی پلانے والا
سنبھلے کس طرح بھلا برچھیاں کھانے والا

چرخ سے آگ برستی ہے زمیں جلتی ہے
مارے گرمی کے زباں خشک ہے لو چلتی ہے

کہیں دم لینے کو سایہ نہیں ہے وقتِ زوال
بیٹھی جاتی ہے زباں پیاس کی شدت ہے کمال

کبھی زینبؑ کا ہے غم گاہ سکینہ کا خیال
دن جو ڈھلتا ہے تو حضرت ہوئے جاتے ہیں نڈھال

مثلِ خورشید بدن ضعف سے تھرّاتا ہے
نیّرِ برجِ امامت پہ زوال آتا ہے

کہتے ہیں ظالموں سے خشک زباں دکھلا کر
بہرِ حق پانی کا اک جام پلا دو لا کر

اہلِ کیں کہتے ہیں یہ تیغ ستم چمکا کر
آبِ شمشیر پیو برچھیوں کے پھل کھا کر

یہ سخن سُن کے بھی غصہ نہیں فرماتے تھے

یاس سے سوئے فلک دیکھ کر رہ جاتے تھے

عرض کرتے ہیں حق خالق سے کہ اے رب غفور
تو ہے عالم کہ نہیں کچھ ترے بندے کا قصور

کرتے ہیں یہ مجھے بیحد و خطا تیرے چور
ہاتھ اُمت پہ اُٹھانا نہیں مجھ کو منظور

جانتے ہیں کہ محمدؐ کا نواسا ہوں میں
پانی پیتے نہیں دو روز کا پیاسا ہوں میں

واقعہ نگاری

اُردو زبان کا ایک مشہور انشا پرداز لکھتا ہے :-

فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں جن کے خیالات، باریکی اور تاریکی عبارت میں جگنو سے اُڑتے نظر آتے ہیں لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں اصلی ماجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں، ایسی ملکا دودھ پیکر اُردو نے پرورش پائی تو اسکا کیا حال ہوگا۔

فارسی کے متعلق تو یہ الزام تسلیم نہیں کیا جا سکتا، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اُردو میں جس چیز کی بڑی کمی ہے وہ یہی واقعہ نگاری ہے، شاعری کی جو صنفیں اُردو میں آئیں وہ قصیدہ اور غزل تھی، ان دونوں کو واقعہ طرازی سے کوئی نسبت نہ تھی، مثنویاں جو لکھی گئیں وہ مورخانہ نہیں بلکہ عاشقانہ تھیں، اسلئے اصلی واقعات کے اظہار کی چنداں ضرورت پیش نہیں آئی، اردو زبان کی نسبت جو کم مائگی کی شکایت ہے وہ زیادہ تر اسی لحاظ سے ہے کہ وہ ہر قسم کے واقعات، معاملات، کاروبار، معاشرت، کے جزئیات کے ادا کرنے پر قادر نہیں، اسی بنا پر، اگر اُردو نظم میں، کوئی تاریخ کی کتاب لکھنا چاہیں تو نہیں لکھ سکتے،

واقعہ نگاری کی دو قسمیں ہیں،

(۱) واقعہ نگار کسی تاریخی واقعہ کو بے کم و کاست نظم کر دے، اس کیلئے صرف زبان پر قدرت درکار ہے، شاعری کی چنداں ضرورت نہیں۔

(۲) واقعہ اجمالاً معلوم ہے لیکن واقعہ نگار، واقعہ کے تمام جزئیات اور حالات

اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہے، وہ واقعہ کی نوعیت کو دیکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس قسم کے موقع پر فطرت کا اقتضا کیا ہے، ان تمام چیزوں کو وہ موجود فرض کر لیتا ہے اور اُن کو ادا کرتا ہے۔

اس قسم کی واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے بالکل بیان واقعی ہو، اور تمام واقعات میں اس قسم کا تناسب، ربط، اور موزونی ہو کہ کسی واقعہ کی نسبت، شک کا احتمال بھی نہ آنے پائے۔ اس قسم کی واقعہ نگاری کیلئے صرف قدرتِ زبان کافی نہیں، بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا درکار ہے،

مثلاً شاعر، احباب کی جدائی کا واقعہ لکھنا چاہتا ہے تو اسکو اُن تمام جزئی کیفیتوں پر نظر ہونی چاہیئے۔ جو اس حالت میں پیش آتی ہیں مثلاً یہ کہ اس حالت میں ایک دوسرے کو کس حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتا ہے؟ کس قسم کی باتیں کرتا ہے؟ کن باتوں سے دل کو تسلی دیتا ہے؟ رخصت کے وقت بے اختیار کیا حرکات صادر ہوتے ہیں آغاز کی کیفیت کس طرح بتدریج ترقی کرتی جاتی ہے؟ حاضرین پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے پھر جُدائی جُدائی میں بھی فرق ہے، باپ بیٹے کی جدائی بھائی بھائی کی جدائی، زن و شوہر کی جدائی احباب کی جُدائی۔ ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ خصوصیات ہیں، ان مختلف، اور کثیر انواع خصوصیات کا احاطہ کرنا، اور ان کو مؤثر پیرایہ میں ادا کرنا شاعرانہ واقعہ نگاری ہے،

اسی طرح لشکر کشی، معرکہ آرائی، فتح و شکست، سفر و حضر، بیماری و موت، قید و بند، بود و نابود، آبادی و بربادی، سینکڑوں ہزاروں واقعات ہیں، اور ہر واقعہ کے سینکڑوں جزئیات ہیں، ان تمام کا احاطہ کرنا اور ان کو ہو بہو ادا کر سکنا، کمال شاعری ہے،

اُردو زبان میں چونکہ ایک مدت تک بیہودہ مبالغہ اور خیال بندی کی گرم بازاری رہی، اس لئے واقعات کے ادا کرنے کیلئے جو الفاظ، ترکیبیں، اصطلاحات مقرر ہیں استعمال میں نہیں آئیں اسلئے آج نئے سرے سے ان کو استعمال کیا جائے تو یا ابتذال یعنی عامیانہ پن یا غرابت یعنی روکھاپن پیدا ہو جاتا ہے، نظیر اکبر آبادی کے کلام میں جو سوقیانہ پن ہے، اسکا یہی راز ہے، میر حسن نے اپنی مثنوی میں اکثر واقعات کا سماں دکھانا چاہا ہے اور یہ اُنکی صحیح المذاقی کا نتیجہ ہے لیکن اکثر جگہ ابتذال پیدا ہو گیا ہے، ع کڑے کو چھڑے سے بجاتی چلی، اگر واقعہ نگاری ہے، تو شعر نے اچھا کیا اگر واقعہ نگاری سے الگ ہے،

واقعہ نگاری جب کمال کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو اس کو مرقع نگاری کہتے ہیں جس کو آجکل کی زبان میں کسی چیز کا سماں دکھانا یا سین دکھانا کہتے ہیں،

میر انیس نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجہ تک پہنچایا ہے، اُردو کیا فارسی میں بھی اُسکی نظیریں مشکل سے مل سکتی ہیں، اُنکے کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں

(۱) ہر قسم کے واقعات و معاملات و حالات اس کثرت سے نظم کئے ہیں کہ واقعہ نگاری کی کوئی صفت باقی نہیں رہی جو اُن کے کلام میں نہ پائی جاتی ہو،

(۲) کوئی واقعہ جب سامنے آتا ہے تو تمام نگاہیں، صرف نمایاں باتوں پر پڑتی ہیں اور اسلئے جب لوگ اُن کو بیان کرنا چاہتے ہیں، تو انہی نمایاں باتوں کو بیان کرتے ہیں لیکن ایک دقیق النظر اُن تمام جزئیات پر بھی نظر ڈالتا ہے اور اگرچہ ظاہر بینی کی نظر سے یہ جزئیات جب اوجھل کئے جاتے ہیں تو سامعین پر اسطرح کا اثر پڑتا ہے گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی، اسکے علاوہ واقعہ کی پوری پوری تصویر کھینچنے سے عمل پر ایک خاص اثر پڑتا

ہے یہ جزئیات اکثر شعر نظر انداز کر جاتے ہیں جسکی وجہ اکثر تو یہ ہوتی ہے کہ اُن پر عام نگاہیں پڑ نہیں سکتیں، اور زیادہ تر یہ کہ ہر شخص اُن کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا، لیکن میر انیس چونکہ فطرت اور معاشرت انسانی کے بہت بڑے رازدان ہیں، اس لئے دقیق سے دقیق، اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی اُنکی نظر سے بچ نہیں سکتا اس کے ساتھ زبان پر یہ قدرت ہے کہ کہیں اُن کو دقت پیش نہیں آتی،

مثلاً ایک موقع پر گھوڑے کی تیز روی کو لکھا ہے، قاعدہ ہے کہ گھوڑا جب حد سے زیادہ تیز دوڑتا ہے تو اکثر اُن کی دونوں کنوتیاں کھڑی ہو کر مل جاتی ہیں، اسکو بعینہٖ اس طرح ادا کیا ہے ع دونو کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

حضرت عباسؑ جب نہر کے پاس پہنچے ہیں، تو گھوڑا جو کئی دن کا پیاسا تھا پانی دیکھ کر بیتاب ہو گیا ہے لیکن حضرت عباسؑ اسکو پانی پینے سے روکتے ہیں، اس موقعہ پر واقعہ کی اصلی صورت کھینچنے کیلئے یہ ضرور ہے کہ اس کشمکش کے موقع پر جو اضطرابی حالت پیش آسکتی تھی وہ دکھائی جائے، چنانچہ میر انیس کہتے ہیں ؎

دو دن سے بیزبان پہ جو تھا آب دانہ بند	دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند	چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند
تڑپا تا تھا جگر کو جو شور آبشار کا	
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا	

یہ شعر حضرت امام حسینؑ کے سامنے اُن کے بھائی کو جب عمرو بن سعد نے پانی بند کرا دیا ہے، اس موقع پر کہتے ہیں ؎ الے ڈگڈگا کے پیاسا منہ جواب

دگدگا کے پانی پینا، ایک معمولی اور غیر اہتمام بالشان واقعہ ہے لیکن ایک تشنہ لب کے ترسانے کے مضمون میں اس کا اظہار، حسن بلاغت کا ایک بڑا ضروری نکتہ ہے۔

یا مثلاً ایک موقع پر گھوڑے پر سوار ہونیکی حالت کو لکھا ہے ع وہ ہاتھ سے کے آپنے رکھا عیال پر، گھوڑے سے ذرا ہٹ کر، ایال پر ہاتھ رکھنا، اور سوار ہونا، سواری کی مخصوص حالت ہے، اسلئے واقعہ کے کھینچنے کیلئے اس حالت کا دکھانا ضرور تھا۔

یا مثلاً حضرت شہر بانو جب اپنی بیٹی صغرٰی سے رخصت ہونے لگی ہیں، تو اصغرؑ کی طرف سے جو صرف چھ مہینے کے تھے، رخصت کے معمولات ادا کراتے ہیں، اس موقع پر اکثر مستورات کا دستور ہے کہ بچے کا ہاتھ اسکی پیشانی پر رکھ کر کہتی ہیں کہ دیکھو یہ تمہیں سلام کرتے ہیں اس حالت کو یعینہٖ ادا کیا ہے ؎

بانو نے کہا دست پسر ماتھے پہ رکھ کر	لو آخری تسلیم بجا لاتے ہیں اصغرؑ

یا مثلاً جوانانِ اہلبیت کی سیر و خوش خرامی کے موقع پر لکھتے ہیں ؎

زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں، ہاتھ میں ہاتھ تھے	لڑکی کبھی بند کھولی ہوئی ساتھ تھی

یا مثلاً جب رفقائے امام علیہ السلام، صفِ نماز سے لڑائی کیلئے اٹھے ہیں اس موقع پر لکھتے ہیں ؎

تیار جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوئے	تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

یا مثلاً حضرت عباسؑ، جب گھوڑا اڑاتے ہوئے نہر کی طرف گئے ہیں، تو دریا کے نگہبانوں سے جو نشیب میں تھے، اس وقت آنکھ چار ہو جاتی تھی، جب گھوڑا زیادہ اونچا اڑ جاتا تھا، اس حالت کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

پرچھیوں مارتا تھا دبدبے فرماں رواؤں سے | آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

یا مثلاً سکینہ جب قید خانہ میں دربانوں سے اپنا حال کہنے گئی ہیں وہاں لکھا ہے، ؎

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر | دیوار پکڑ سے پکڑے گئی وہ قریب در
پیٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر | دربانوں جاگتے ہو کہ سوتے ہو بیخبر

بیکس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں
کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

دو حریفوں کی معرکہ آرائی کو جہاں مرزا دبیر وغیرہ لکھتے ہیں، صرف عام طرح پر اوپری اوپری باتیں لکھ دیتے ہیں یہ مطلق پتہ نہیں چلتا کہ دونوں نے فن جنگ کے کیا کیا ہنر دکھائے ہیں، لیکن ہمارے انیس اکثر جگہ ان خصوصیات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، اور یہ انکی قدرت زبان کی سب سے بڑی دلیل ہے مثالیں زمینہ کے عنوان میں آئیں گی، اب ہم ہر قسم کی واقعہ نگاری کی چند مثالیں درج کرتے ہیں،

حضرت امام حسینؑ کا کربلا میں داخلہ، دشمنوں کی روک ٹوک رفقائے امام کی برہمی، امام علیہ السلام کی صلح پسندی اور درگذر وغیرہ وغیرہ ؎

ترا یہ کہہ کے کشتی امن کا ناخدا | جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے ہر ایک سے کہا | دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا

اکبرؑ شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہ سریلند | کیوں یہ مقام ہے تمہیں شاید بہت پسند

کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہ ارجمند
بس ہاتھ خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند

شیراب ہیں رہیں گے عنایت جو آپ کی
بس کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے

رہتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام
گویا زمیں کی سیر کو اترا مہ تمام
انجم کی طرح گرد تھے بدر کے غلام
شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام

تھیں ہوائیں اڑتی تھیں تھوپیں تھوپے تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

تکنے لگے پہاڑوں کو مسلم کہ دو نہال
پھولوں سے کھیلنے لگے زینت کے نونہال
سبزے سے وہ ان کی ایسی حسن خوش جمال
کی عرض اس زمین کا یہ گل ہے یہ مثال

اے خسرو زمین یہ جگہ ہے جلوس کی
خوشبو ہے یاں کی خاک میں عطر عروس کی

صحرا سے آئے پھر سوئے دریا وہ محتشم
الیاس شاہ دیکھ کے پکارے بصد حشم
اچھلیں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم
بولے جناب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم

پانی میں روشنی ہوئی حسن حضور سے
لے لیں بلائیں پنجۂ مرجان نے ضرور سے

ٹھہرے کنارے نہر جوانان ماہرو
دھویا کسی نے رغبت کسی نے کیا وضو
گھوڑے جو آئے پینے بٹھائے کنار جو
بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیر نیک خو

کھینچی اک آہ سرد ترائی کو دیکھ کر
ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسِ نامور
خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہِ بحر و بر
ایذا ہے محملوں میں بہت اہلِ بیت پر
بچے ہیں نازکی میں گلوں سے زیادہ تر

کب سے عماریوں کے ہیں پردے چھٹے ہوئے
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے مرکے ہوئے

کچھ سوچکر امامِ دو عالم نے یہ کہا
زینبؑ جہاں کہیں ہیں خیمہ کرو بپا
پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباسِ باوفا
جاکر قریبِ محملِ زینبؑ یہ دی صدا

حاضر ہے جاں نثار امامِ غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

بولی یہ سُنکے دخترِ خاتونِ روزگار
اس دشت میں بھلا مجھے کیا دخل میں نثار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار
ہر جا مسافروں کا نگہباں ہے کردگار

مختار کائنات کے تم نورِ عین ہو
انزو وہاں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہے گھر
رکن آفتوں میں پانچ مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں یہ گرمی کے ایام یہ سفر
دن بھر چلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر

گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اُجاڑ تھا
اِک ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا

آج اس زمین پر ہمیں لایا ہے آسماں
اب دیکھئے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں
یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں

دشمن بہت ہیں بادشہ خوشخصال کے

بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

بھائی سے اس زمین کی سُنی ہے بہت صفت
ہے وہ امام واقفِ اسرار شش جہت
جو جو سخن ہیں اُن سے بھی لازم ہے مصلحت
صدقے گئی حبیب سے بھی کر لو مشورت

ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو
بھیّا مجھے یہ ڈر ہے کہ رد و بدل نہ ہو

دستِ ادب کو جوڑ کے اُس شیر نے کہا
تشویش کچھ نہ کیجئے اے بنت مرتضیٰ
ہر چند مصلحت مری کیا اور عقل کیا
لیکن ترائی سے کوئی بہتر نہیں ہے جا

جو نہر فاطمہؑ میں ہے یہ وہ فرات ہے
گرمی میں قربِ نہر کا آبِ حیات ہے

حضرت کے حکم کا منتظر صدقے جاں نثار
ارشاد یہ ہوا کہ دیا تم کو اختیار
آیا حضور سبطِ پیمبر وہ ذی وقار
کی عرض خیمہ نہر پہ کرتا ہے خاکسار

اُترین یہیں یہ مرضیِ آلِ رسول ہے
بولا وہ بحرِ فیض کہ اچھا قبول ہے

یہ سُن کے خادموں کو پکارا وہ مہ جبیں
فرّاش آ کے جلد مصفّا کریں زمیں
حاضر ہوں آ بپاش محل دیر کا نہیں
یاں ہو گا خیمہ حرم بادشاہِ دیں

جلدان کو بھیجو لوگ ہیں جو کاروبار کے
لے آؤ اشتروں سے قناتیں اُتار کے

بولے زہیر قین کہ حاضر ہیں سب غلام
برھکر حبیب بھی ہوئے مصروفِ اہتمام
کرسی منگا کے بیٹھ گئی اک طرف امام
رتبے میں ہو گئی وہ زمیں عرش احتشام

پرتو فگن تھا نور رسالت مآب کا
سر پر لگا تھا چتر زری آفتاب کا

تھا فکر میں خموش دو عالم کا تاجدار
کھلوا رہے تھے خیمہ کو عباس ذی وقار
ناگہ اُٹھا شمال کی جانب سے اک غبار
رایت سیاہ و رُخ نظر آئے تین چار

مڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہے
بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہے

یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی
ڈنکے کی دشتِ ظلم سے کوسوں صدا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی
جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی

اک ایک پیل زور تہمتن شکوہ تھا
ابن رکاب سبز قدم سرگروہ تھا

بولے ملازموں سے یہ عباسؑ باوفا
دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا؟
آنے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کون سا
کہدو کہ اہلبیت کی خیمہ کی ہے یہ جا

لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
اُتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

کرسی نشیں ہے لخت دلِ سید البشر
آئین خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
آتی ہے اُڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد اور
کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں یہ خیرہ سر

بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑوں پہ ظالم سوار ہیں

اُس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام
حکمِ امیر ہے یہیں اُترے سپاہِ شام

چھوڑینگے ہم اُسے کہ جو رحمت کا ہی مقام
دریا سی ہٹ کے آپ بپا کیجئے خیام

لشکر کشی ہی بادشہِ کائنات پر
کل مورچے سپاہ کے ہونگے فرات پر

کوفے سے کل جوان ادھر آئے ہیں دس ہزار
رستے میں شام کے ابھی فوجیں ہیں بیشمار
خالی ہیں منزلیں نہ بیاباں نہ کوہسار
شہروں سے پرگنوں سے چلے آتے ہیں سوار

لاکھوں میں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گنتی ملے گی جب پسر سعد آئے گا

فوجوں کا جائزہ تھا وہاں ہم چلے تھے جب
گردے میں بیس کوس کے لشکر پڑا تھا سب
دستوں کی روم شام کی آمد ہی روز و شب
اس ارض پر نہ ہو جو سمائی تو کیا عجب

کیجئے مقام گر کوئی گوشہ جدا ملے
ممکن نہیں کہ نہر پہ خیمے کی جا ملے

ہم گھاٹ روکنے کیلئے آئے ہیں ادھر
ہے آج شب کو داخلہ شمر کی خبر
سنتے ہی یہ نرائی میں گونجا وہ شیر نر
تیوری چڑھا کی تیغ کی قبضہ پہ کی نظر

کم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم
نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے نمٹینگے ہم
گر فوجِ قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم
گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم

پھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

تم کون ہو حسینؑ ہے مختار خشک و تر
ان کے سوا ہے کون شہنشاہ بحر و بر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر
شیروں کا یاں عمل ہی نہیں کیا نہیں خبر

سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہدیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب
بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب
نیزے علم کئے ہوئے تھے نیزہ دار سب
باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب

لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اُس دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

بگڑے ابو ثمامہ و سعد فلک سریر
تولی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر
جوڑا کمان میں ابن مظاہر نے ایک تیر
بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر

عابسؑ کو غیظ لشکر بدخو پہ آگیا
غصے سے بل ہلال کے ابرو پہ آگیا

اُلٹی جناب قاسمؑ ذیشان نے آستیں
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبر حسینؑ
بولے پکڑ کے نیمچے زینبؑ کے مہ جبیں
شیروں سے کیا ترائی کو لینگے یہ اہل کیں

کہیے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آگے تھے سب کے حضرت عباسؑ ذی حشم
بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دمبدم
تیغیں جو تولتے تھے ادھر بانیِ ستم
کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم

لرزہ تھا رعب حق سے ہر اک نابکار کو

روکے تھا ایک شیر جری دس ہزار کو

بڑھتا تھا جو منا ہوا جس دم وہ شیر نر
گرتا تھا کوئی ڈر کے اِدھر اور کوئی اُدھر
تیغیں جو کھچ گئیں تو ہوا اور شور و شر
گھبرائے اہلبیت شہنشاہِ بحر و بر

آغوش میں پھوپھی کے سکینہؑ دہل گئی
غُل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی

چلائی رو کے زینبؑ ناشاد و نامراد
ہے ہے کہ خبر تو لو کہ یہ کس سے ہوا فساد
غربت زدوں سے کیا سببِ کینہ و عناد
دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہ خوش نہاد

ہمشیر کو نثار امام امم کرو
لوگو دعائیں اکبرؑ مہرو پہ دم کرو

محمل سے مُنہ نکال کے فضہؑ نے یہ کہا
بلوہ کنارِ نہر ہے اے بنت مرتضیٰ
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا
قبضہ پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسؑ باوفا

کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہی شیر کو

زینبؑ پکاریں پیٹ کے زانو بصد ملال
ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انہیں جلال
کہہ دے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال
غربت پہ ابنِ فاطمہؑ کی تم کرو خیال

قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصہ کو تھام لو

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہرِ امام
عباسؑ اُدھر غضب میں بڑھے سوئے نہر و شام
کُرسی سے جلد اُٹھ کے پکارے شہِ انام
بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام

یکساں ہے بحر و بر ہماری نگاہ میں
غیظ و غضب کو دخل ندو حق کی راہ میں

آؤ تمہیں قسم ہے جناب امیر کی
بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیر کی
سب سے جدا ہی چاہیے منزل فقیر کی

کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کیو واسطے
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم
بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صلعبِ کرم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم
چُپ ہو گئے قریب جب آئے شہِ امم

گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور
کہدے تجھے ابن سعد کاٹ کے لیجائیں سر ابھی
حکمِ خدا ہے حکم شہنشاہِ بحر و بر
اب کچھ کہوں زبان سے کیا تاب کیا جگر

میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
کیوں کل بنتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا کیا
لو اب اٹھا لو تیغ و سپر تم پہ میں فدا
دریا کو تم تو لے چکے اے سیر مہ لقا

وہ شیر ہو کہ دھاک ہے ساری خدائی میں
دیکھو کوئی تمہارے سوا ہے ترائی میں

۲ حضرت عباسؑ جب میدان جنگ میں گئے ہیں تو شمر نے یہ ترغیب دی کہ ناحق

آپ اپنی جان کیوں گنوا تے ہیں اُدھر سے ٹوٹکر ہماری طرف آجایئے تو منصب اور جاگیر اور کیا کچھ نہ ملیگا حضرت عباسؑ نے برہم ہوکر اسکی درخواست کو رد کیا یہ سوال و جواب ہو رہا تھا کہ دشمنوں نے یہ خبر اُڑادی کہ عباسؑ ہماری طرف آگئے اہلبیت اور خاصکر حضرت عباسؑ کی بیوی پر اسوقت جو اثر ہوا، اور جو باتیں ہوئیں اُنکو کس خوبی سے ادا کیا ؎

واں شمر و علمدار میں ہوتی تھی یہ تقریر
یاں خیمے کی ڈیوڑھی پہ کھڑی تھی شہ دلگیر
خیمے کے قریب آن کے اک ظالم بے پیر
چلایا کہ لوٹ گئے بازوئے شبیر

اِس فوج میں فرزند امیر نجف آیا
عباسؑ علمدار ہماری طرف آیا

اکبرؑ سے یہ بولا پسر مخبر صادق
کاذب ہیں جفاکار ہیں مفسد ہیں یہ فاسق
یہ بات نہیں رتبہ عباسؑ کے لائق
وہ ہے مرا شیدا مرا یار و مرا عاشق

بھائی سے کنارا کبھی بھائی نہ کریگا
عباسؑ علی مجھ سے برائی نہ کریگا

ناموس نبی میں بھی یہ چرچا ہوا اک بار
زینب نے کہا یہ تو نہ مانوں گی میں زنہار
کہنے لگی تب زوجۂ عباسؑ علمدار
کیا ماجرا ہے بی بی مجھ سے کرو اظہار

ہے دیر سے اک شور یہ لشکر کہیں میں
وارث مرا کیا قید ہوا لشکر کہیں میں

لہ یہاں عجب بلاغت کا اظہار کیا ہے، حضرت عباسؑ کی بیوی لوگوں سے واقعہ کو تحقیق کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن یہ ان کی زبان سے نہیں نکل سکتا۔ کہ درحقیقت عباسؑ دشمنوں سے مل گئے ہیں اسلئے اُنہوں نے اس پیرایہ میں سوال کیا کہ کیا دشمنوں نے اُن کو قید کرلیا، یعنی اگر وہ دشمنوں کے مجمع میں چلے بھی گئے تو قید ہو کر گئے ہونگے ورنہ یہ امر بالکل ناممکن ہے کہ وہ دشمنوں سے جاکر مل جائیں ۱۲ منہ

بولی یہ سکینہ[1] کہ چچی تم سے کہوں کیا
روتے ہیں کمر کپڑے ہوئے ہاتھوں سے بابا

اور کہتے ہیں آپس میں خوشی ہو گئے یہ اعدا
عباسؑ علمدار سے شہ دین ہوئے تنہا

اس صدمے سے تنہا سا کلیجہ مرا شق ہے
میں پیاس بھی بھولی ہوں عمو کا قلق ہے

چپکے سے سکینہؑ نے کہا جا کے بصد یاس
غرقِ عرق شرم ہوئی زوجۂ عباسؑ

گھبرائی ہوئی خیمے کی ڈیوڑھی کو گئی پاس
پھر سوچ کے کہتی تھی کہ جاؤں پہ نہ جاؤں

تو تو شہ والا کی انہیں ہے تو فقط ہے
عباسؑ پھرے شہ سے نہ مانوں کی غلط ہے

بھائی کو وہ پیارے ہیں نہیں بھائی ہے پیارا
عاشق کہیں معشوق سے ایسے نہیں کرتا

ننگ علم دار کو ہوگا نہ گوارا
قسمت ہی الٹ جائے تو اس کا نہیں چارا

لیکن فلک اس طرح سے کرتے نہیں دیکھا
بھائی کو کبھی بھائی سے پھرتے نہیں دیکھا

اس سوچ میں پھرتی تھی سراسیمہ و مضطر
اس کا بھی نہ تھا ہوش کہ ہے سر پہ کھلی چادر

دریا کا تھا دل کانپتا سینہ کے اندر
دریا کا تھا کیا کہیے کہ تھرکے سرِ محشر

یارب یہ سنوں میں کہ جدا ہو گئے عباسؑ
یا غل ہو کہ بھائی پہ فدا ہو گئے عباسؑ

اکبرؑ کہا بیٹے سکینہ کو ذرا ڈھارس
باندھو کمر اور جنگ کا ہتھیار لگاؤ

[1] اس بلاغت کو دیکھو کہ اہل حرم سے کسی نے اس جھوٹی خبر کا زبان پر لانا بھی نہ چاہا بلکہ بالکل بچی تھیں اسلئے انہوں نے یہ سنا تو اطمینان کر دیا۔

تم شیر کے فرزند ہو میدان میں جاؤ
بیتاب ہوں اے لال خبر باپ کی لاؤ

تھے پانی کو دریا کے کنارے گئے عباسؑ
دیکھ آؤ کہ لڑتے ہیں کہ مارے گئے عباسؑ

غیرت سے موئی جاتی ہوں میں بیکس و ناچار
کہتے ہیں عدو پھر گیا بھائی سے علمدار

صدقے گئی کہتو مری جانب سے بتکرار
کیا قہر ہے تم شمر سے کیوں کر کہو گفتار

یہ تفرقہ انداز ہے مردودِ خدا ہے
شبیرؑ کے دشمن سے علاقہ نہیں کیا ہے

۳۔ ابن سعد کربلا میں داخل ہوتا ہے، اور خولی سے حالات دریافت کرتا ہے خولی ایک ایک چیز کی تفصیل بیان کرتا ہے ۵

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشاں
اُمڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بیکراں

موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں
لہراتے تھے ہوا سے علم مثل بادباں

ہلتا تھا دشت کیں دل اسطرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کی پری شامیوں کا دل
خوف خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل

مکار اہل نار و دغا باز پر دغل
شکلیں مہیب دیو سی قد بردوں پہ بل

بدخواہ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے چلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلواریں کھینچے بڑھکے جمی دو طرف سوار
غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار

ڈنکے کی دمبدم تھی صدا آسماں کے پار
"آگے بڑھے چلو" یہ نقیبوں کی تھی پکار

گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زرّیں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

اترا قریبِ خیمۂ فرش سے وہ خیرہ سر
سر پر لگا یا دوڑ کے خادم نے چترِ زر
پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر
بولا کسی سے پھر وہ سوئے نہر دیکھ کر

خیمہ ہے کس طرف کو شہِ خوش خصال کا
دریا پہ تو عمل نہیں زہراؑ کے لال کا

خولی نے تب کہا کہ ہمارے طرف ہے نہر
آئے تھے یاں اُتر کے خاطرِ امامِ دہر
فرماتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا قہر
ہم نے اُٹھا دیا انہیں لیکن بجبر و قہر

عباسؑ مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو
شبّیرؑ پھیر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

وہ دھوپ میں ہے خیمۂ زنگاریِ حسینؑ
راحت نہ رات کو ہے کوئی دم دن کو چین
پہروں علیؑ کی بیٹیاں روتی ہیں کہکے ہین
آفت میں مبتلا ہے محمدؐ کا نورِ عین

بچوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے
خیمہ نہ سایہ میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شقی کہ کتنی ہے فوجِ شہِ امم
سنتے تھے واں سپاہِ حسینی کی دھوم ہم
اُس نے کہا حسینؑ کے یاور ہیں کم بہم
فاقوں کے مارے دم میں کسی کی نہیں ہے دم

ایسی تو فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گنا ہے اکاسی جوان ہیں

ہے اک علم یہ قلتِ لشکر کا ہے نشاں
یہ حال ہے لٹا ہوا جیسے ہو کارواں

اُردو میں حلق بس غم کے سوا جنس ہے گراں
غلہ کی یہ کمی ہے کہ ہے قحط آب و ناں

اسوار بھی قلیل پیادے بھی تھوڑے ہیں
کُل سترہ تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

مطبخ ہے سرد آگ کا اس میں نہیں ہے نام
بچے ہوئے گرم سی بنیاب ہیں تمام
خاک آباد خانے میں اُڑتی ہے صبح و شام
کیونکر لڑینگے بیکس و مظلوم و تشنہ کام

یاں سینکڑوں کمانیں ہیں فوج امیر میں
دو دو ڈگر ہیں کے خاک پہ ایک ایک تیر ہیں

یہ سب غلط سُنا تھا کہ ہے لشکر کثیر
ہیں اُن میں سات آٹھ تو لڑکے کئی صغیر
کچھ نوجواں ہیں طفل ہیں کچھ اور کچھ ہیں پیر
پن جائینگے وہ ٹاپوں سے ہنگام دار و گیر

کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائینگے
اُن سے تو نیمچے بھی سنبھالے نہ جائینگے

کیا جانے دل میں سوچے تھے کیا شاہ کربلا
مقتل میں کھینچکر انہیں لے آئی ہے قضا
لشکر تو یہ قلیل اور اس فوج سے دغا
عمریں ہیں چھوٹی چھوٹی بھلا وہ لڑینگے کیا

کچھ آزمودہ کار نہیں کچھ مسن نہیں
ان کی ابھی تو گھر سے نکلنے کے دن نہیں

ہمشکل مصطفےٰ کو تو اٹھارواں ہے سال
تیرہ برس کا ہے ابھی شبّر کا نونہال
نو دس برس کے ہونگے زینب کے دونوں لال
ہاں اک جوان ہیں حضرت عباس خوش خصال

چھوٹے ہیں اور سب کوئی اُن میں جواں نہیں
خط اک طرف مسین بھی کسی کی عیاں نہیں

سنتا ہوں میں ہیں دو پسر شاہ نامدار
بیمار اُن میں ایک ہے اور ایک بیقرار
زینبؑ کے دو ہیں نین حسنؑ کے ہیں گلعذار
دس ہیں عقیلؑ و مسلم و حیدر کی یادگار

زہراؑ کے جان دل ہیں محمدؐ کے پیار ہیں
یہ سترہ تو چاند ہیں باقی ستارے ہیں

بتیس سب سوار شہ دیں کے پاس ہیں
اب رہ گئی پیادے سو وہ بھی پچاس ہیں
آفت میں مبتلا ہیں مگر باحواس ہیں
غازی ہیں سرفروش ہیں اور خوش حواس ہیں

کھانے کا ہے خیال نہ پانی کی فکر ہے
سجدے ہیں اور دعائیں ہیں اور حق کا ذکر ہے

بولا وہ تب کہ ہونگے جواں یاں کے کئی ہزار
خولیؔ نے کی یہ عرض کہ ممکن نہیں شمار
ہیں تین چار کوس کے گرد و پیش سب سوار
اک اک جوان ہے رستم میدان کارزار

کیا کوئی لڑ سکیگا قیامت کی فوج ہے
لشکر کی ہیں صفیں کہ سمندر کی موج ہے

پیدل ہیں اک طرف تو رسالے ہیں اک طرف
خنجر ہیں ایک طرف تو بھالے ہیں اک طرف
جانباز ہاتھ قبضوں پہ ڈالے ہیں اک طرف
اور دامن سوار پہ چھپیوں والے ہیں اک طرف

سب لوگ فکر قتل شہنشاہ دیں میں ہیں
کھینچے ہوئے کمانوں کو سرکش کمیں میں ہیں

ہاتھوں میں پہلوانوں کی ہیں گرز گاؤ سر
ضربت سے جن کی ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر
ہو جا بچھی ہوئی ہیں کمندیں ادھر ادھر
کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی نہر پر

سب لوگ جا بجا پے قتل دستیز ہیں

	تیغیں بھی ہیں اُٹھی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں
بھالا ہلا کے کوئی یہ کہتا ہے بار بار	نوکِ اِسکی سینۂ علی اکبرؑ کے ہوگی پار
کہتا ہے کس غرور سے اک شام کا سوار	آئے تو رن میں حضرتِ شبّر کا یادگار
	اب کوئی دم میں گھر کے حسنؑ کی صفائی ہے
	تلوار آج زہر میں میں نے بجھائی ہے

۴ - فوج آراستہ ہو رہی ہے اور عَلَم لاکر رکھا گیا ہے عون و محمد جو امام علیہ السّلام کے بھانجے اور حضرت زینبؑ کے صاحبزادے ہیں۔ عَلَم کے استحقاق کے دعویدار ہیں اور چاہتے ہیں کہ امام علیہ السّلام سے اس منصب کی درخواست کریں۔ اس وقت کی گفتگو، حضرت زینبؑ کی آزردگی، اور فہمائش اور دیگر واقعات ۵

زینبؑ کے پسر مشورہ کرتے تھے یہ باہم	کیوں بھائی عَلَم لینے کو ماموں سے کہیں ہم
تائید خدا چاہیئے گو عمر میں ہیں کم	عہدہ تو ہمارا ہے یہ آگاہ ہے عالم
	واقف ہیں سبھی حیدرؑ و جعفرؑ کے شرف سے
	حق پوچھو تو حقدار ہیں ہم دونوں طرف سے
دادا بھی علم دار ہے نانا بھی عَلَم دار	ہم اپنے بزرگوں کی ہیں منصب کی طلبگار
کہتا تھا بڑا عرض کا موقع نہیں زنہار	ہیں بادشہِ کون و مکاں مالک و مختار
	عہدہ تو بڑا یہ ہے کہ ماموں پہ فدا ہوں
	چپکے رہو اماں نہ کہیں سُنکے خفا ہوں
مطلب نہ عَلَم سے نہ حشم سے ہمیں کچھ کام	مٹ جائیں نشاں بس یہی عہدہ یہی نام
یہ سر ہوں نثارِ قدم شاہ خوش انجام	عزت رہے بھائی یہ دعا ہے سحر و شام

آقا جسے چاہیں عسلم فوج خدا دیں
مشتاقِ اجل ہیں ہمیں مرنیکی رضا دیں

روتی تھی جو پردہ کے قریں زینبِ دلگیر
سب اُس نے مفصل یہ سنی بیٹوں کی تقریر
فضہ سے یہ کہنے لگی وہ صاحبِ توقیر
دونوں کو اشارے سے بلائے کسی تدبیر

کچھ کہنا ہے سُن لیں اُسے فرصت انہیں گر ہو
عباسؑ نہ دیکھیں نہ شہ دیں کو خبر ہو

یہ کہتی تھی زینبؑ کہ خود آئے وہ نکوکار
چھوٹے سے یہ فرمانے لگیں زینبِ ناچار
کیا باتیں ابھی بھائی سے تھیں امرِ دلدار
اس وقت میں ہم کون سے منصب کے طلبگار

سمجھے نہ کہ مادر عقب پردہ کھڑی ہے
گھر لٹتا ہے میرا تمہیں منصب کی پڑی ہے

اللہ بڑا عزم کیا باندھ کے تلوار
بچو تمہیں ایسا نہ سمجھتی تھی میں زنہار
دیکھو ابھی تم دونوں سے ہو جاؤنگی بیزار
کچھ کہیو نہ ماموں سے خبردار خبردار

کیا دخل تمہیں امر میں سلطانِ اُمم کے
دیکھوں گی پھر منہ جو گئے پاس عَلَم کے

کچھ اور ہی تیور ہیں عَلَم نکلا ہی جب سے
تم کون ہو جو آگے بڑھے جاتے ہو سب سے
استادہ ہو جا کر عقبِ شاہ ادب سے
عہدہ ہی یہ جس کا مجھے معلوم ہی شب سے

اس امر میں خاطر نہ کریں اور کسی کی
میں خوش ہوں بجا لائیں وصیت کو علی کی

مانا کہ پہنچتا ہے تمہیں منصب جعفرؑ
آقا کی غلامی سے ہی عہدہ کوئی بڑھکر

چھوٹا مرا بھائی بھی ہے بیٹوں کے برابر
عاشق کا تو عاشق ہے برادر کا برادر

بگڑو نہ گی گاگر کسی اسلوب کرد گے
عباس سے کہیو تم مجھے محجوب کر دگے

زینب نے سنا یہ تو کہا بھائی سے ہنس کر
بولیں کہنے لگے جوڑ کے ہاتھوں کو وہ لدار

شاہوں سے شہنشاہوں سے بھی کی ہے کچھ انکار
ناموس ہیں جب چاہیں عمل دیں شہ ابرار

رخصت کیلئے تیغ و سپر باندھے ہوئے ہیں
ہم صبح سے مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں

زینب نے کہا بھائی کے صدقے میں گئی ہوں
بس اب تو چلو شاہ ہوا لے مری پیارو

اس وقت کی سر قدم شاہ پہ وارو
ہو عید مجھے گر غم و ماتم کو مارو

یہ وقت ہے ارشاد امام ازلی کا
دے چھوٹے سے ہاتھوں میں علم اور علی کا

۵ حضرت علی اکبر میدان جنگ میں جانے کیلئے پھوپھی اور ماں سے جازت طلب کرتے ہیں۔ ان دونوں کا اضطراب۔ اور سوال و جواب ۵

چھاتی سے لگا کر رونے لگے اکبر غریں
چھاتی لگا یا ماں نے پھوپھی نے بلائیں لیں

آکر وہ سر و بر کے یہ لاڈلا مہ جبیں
زینب میں ظالموں کے اکیلے ہیں شاہ دیں

روتے ہیں خیر سیدہ والا کے حال پر
اماں مقام رحم ہے بابا کے حال پر

اعدا کا ظلم بھائی کا غم تین دن کی پیاس
بازو شکستہ ضعف بصارت ہجوم یاس

اب میں ہی اور کوئی نہیں شاہ دیں کے پاس
اس پر بھی اضطراب نہیں کچھ زہے حواس

گھیرے ہیں سب امام غریب الدیار کو
تنہا کھڑے ہیں نوے ہوئے ذوالفقار کو

تنہا کہاں امام کہاں وہ ہجوم عام
ہیں ہاں ہوں اب تو اور بڑھی ہوگی فوج شام
فریاد ہے کوئی نہیں آتا ہمارے کام
مٹتا ہے صفحۂ دوجہاں سے پدر کا نام

مظلوم باپ آنکھوں کے آگے ہلاک ہو
بیٹا جوان ہم سنہ ہیو ند خاک ہو

تقدیر نے کیا نہ شہادت سی بہر باب
اچھا مریں گے بعد شہ آسماں جناب
ہم بھی نہیں اگر نہیں فرزند بوتراب
ذرہ کہاں غروب ہوا جب کہ آفتاب

دنیا کا نور پیغمبر اعظم کے ساتھ ہے
اپنی تو زندگی شہ عالم کے ساتھ ہے

مجھ کو تو آرزو ہے کہ سر کو فدا کروں
راہ خدا میں فوج سے تنہا دغا کروں
سر سے حقوق والد ماجد ادا کروں
مالک مرے اگر نہ رضا دیں تو کیا کروں

وان اقتلوا الحسینؑ کا اعدا میں شور ہے
پر کچھ ہمارا پالنے والوں سے زور ہے

تم دونوں صاحبوں سے مرے اب ہیں دو سوال
اوّل تو یہ کہ دیجئے مجھے رخصت جدال
رکھ لیجے آبرو سے پسر بہر ذوالجلال
آگے مرے شہید نہ ہو فاطمہؑ کا لال

للہ ہاتھ اٹھائیے اب نور عین سے
آماں ہمیں عزیز نہ کیجے حسینؑ سے

ہے دوسری یہ عرض کہ جو رخصت نہیں قبول
جلدی ہو کربلا سے روانہ یہ آل رسول

یثرب سے کیا علاقہ ہے بطحا سے کیا حصول
نہ جائینگے نجف نہ سوئے روضۂ رسولؐ

جنگل کی راہ لینگے گریباں کو پھاڑ کے
کافی ہیں منہ چھپانے کو دامن پہاڑ کے

پوچھیں جو دوستانِ مدینہ مری خبر
کہدیجئے نہ آئینگے اب وہ کبھی ادھر

صدقے امامِ دیں پہ ہوئے سارے نامور
کچھ ان سے ہو سکی نہ مددگاری پدر

بستی بسا کے رن میں شہِ کربلا رہے
کنبہ سے منہ چھپا کے وہ جنگل میں جا رہے

رونے لگا یہ کہہ کے جو وہ دیوں کا ماہ
بنتِ علیؑ کی آنکھوں میں دنیا ہوئی سیاہ

بھاوج کے منہ پہ یاس سے زینبؑ نے کی نگاہ
گردن ہلا کے مائے بھری ایک سرد آہ

بنتِ علیؑ تو خاک پہ تھرا کے گر پڑی
بانو لپٹ کے پاؤں پہ غش کھا کے گر پڑی

ماں کو اٹھا کے خاک سے رونے لگا پسر
بیٹے کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر

مجھ کو بھی لیلو ساتھ جو منظور ہے ظفر
زینبؑ پکاریں چھوڑ کے ہمکو چلے کدھر

اچھا رضا حسینؑ سے لیلو تو جائیو
کاندھا مرے جنازے کو دے لو تو جائیو

اک دن وہ تھا کہ سوتے تھے چھاتی پہ رات بھر
کرتہ وہ پہنے دوڑتے پھرنا ادھر ادھر

یاد آتی ہیں وہ ہنسلیاں وہ کان کی گہر
یا آج تیغ ہاتھ میں ہے دوش پر سپر

غازی ہو صف شکن ہو سعادت نشان ہو
کیا کام ہم سے نام خدا اب جوان ہو

داد اکامر تبہ تمہیں دے رب ذوالجلال | قائم تمہارے سر پہ رہے فاطمہؑ کا لال
قابل ہے رحم کرنے کے واری ہمارا حال | بچپن کی دائیوں کا بھی رکھیئے ذرا خیال

کس سے ہو پھر امید اگر تم سے یاس ہو
اب تو تمہیں ہمارے بڑھاپے کی آس ہو

وت تمہیں ہو دل کی تمہیں پارۂ جگر | یہ بھی خبر نہیں مجھے کب مر گئے پسر
ثیں بھی گھر میں آئیں تو پیٹا نہ بس کسر | میں کہتی تھی جیئے یہ میرا غیرت قمر

اکبرؑ تو ہے اگر مرے پیارے نہیں نہیں
روشن ہے گھر میں چاند ستارے نہیں نہیں

ین یہ کر کے منہ پہ لیا گوشۂ ردا | سر چوب سے ٹیک کے کہا وا محمداؐ
س گر پڑا پھوپھی کے قدم پہ وہ لقا | کی عرض رو کے ای پھوپھی اماں کروں میں کیا

میں بیوفا نہیں ہوں یہ روشن ہے آپ پر
نرغہ ہے فوج کا مرے مظلوم باپ پر

نہ سے ہٹایئے تو روا پھر کروں گا | اچھا نہ جائینگے سوئے میدان کارزار
در ہٹا کے منہ سے یہ بولی وہ دلفگار | میں کون ہوں صدقے جاؤں تمہیں کو ہے اختیار

اصغرؑ ہو یا کہ تم ہو مجھے سب سے یاس ہے
رخصت گلا کٹانے کی لو ماں تو پاس ہے

بر نے ماں کے چہرۂ اقدس پہ کی نظر | ماں نے کیا اشارہ کہ اے غیرت قمر
سے پھوپھی خفا ہیں جھکا دو قدم پہ سر | قربان جاؤں عذر کرو ہاتھ باندھ کر

سر کی نہ کچھ خبر ہے نہ چادر کا ہوش ہے

واری یہ پالنے کی محبت کا جوش ہے

جلدی سے ہاتھ جوڑ کے بولا وہ لالہ فام
تقصیر عفو کیجئے اے خواہر امام
بس اب زباں سے کچھ نہیں کہنے کا یہ غلام
میری تو ماں ہیں آپ مجھے کیا کسی سے کام

بندے پہ کی ہے ماں نے یہ شفقت نہ باپ نے
راتوں کو جاگ کر مجھے پالا ہے آپ نے

اکبرؑ نے یہ کلام کئے جب بصد ادب
الفت کا جوش آگیا بنت علیؑ کو تب
لیکر بلائیں بہن کی بولی وہ تشنہ لب
کرتے ہو کیسے میں تمہیں رخصت کہو کہ اب

سچ ہے جہاں میں تم سا کوئی باوفا نہیں
واری تمہارے سر کی قسم ہیں خفا نہیں

کیوں کانپتے ہو اشک ہیں آنکھوں سے کیوں رواں
تم راست گو ہو سچ ہی تمہارا یہ سب بیاں
لو میں نے دی رضا تمہیں اے میرے نوجواں
تم جانو آگے صدقے گئی اور تمہاری ماں

یوں تو تمام گھر کو محبت ہے آپ سے
کچھ ماں کا حق بھی کم نہیں ہوتا ہے باپ سے

آنکھیں بچھائیں ماں نے جو تم گھٹنیوں چلے
تلوؤں سے اسکے دیدۂ حق بیں سدا ملے
نازوں سے منتوں سے مرادوں سے تم پلے
صدقے ہوئی کبھی تو لگایا کبھی گلے

مادر نے اپنی عمر مصیبت میں کھوئی ہے
برسوں پہ بی بی ایک ہی کروٹ سوئی ہے

بانو نے ہاتھ جوڑ کے زینبؑ سے یہ کہا
صدقے گئی کنیز کی خدمت کا ذکر کیا
اس قافلہ میں آپ ہیں اب فاطمہؑ کی جا
میں نے بھی دی جو آپنے بیٹے کو دی رضا

صدقے ہے یہ بھی صورتِ پروانہ آپ پر
پر کیا کرے کہ آج مصیبت ہے باپ پر

یہ ذکر تھا کہ آئے شہنشاہِ بحر و بر
لے لیں بلائیں بھائی کی زینبؑ نے دوڑ کر

بانوؑ بھی روئی شہ کے قدم پر جھکا کے سر
بولی لپٹ کے بالی سکینہؑ کہ اے پدر

سنتی تھی میں کہ رن سے علمدار آتے ہیں
لو اب تو گھر سے نہر پہ بھیا بھی جاتے ہیں

بانوؑ کے منہ کو دیکھ کے حضرتؑ نے یہ کہا
کیوں بیج ہے تم نے بیٹے کو مرنے کی دی رضا

وہ چپ ہوئی تو لے لی بہن سے شہِ ہدا
کہیے پھوپھی جھگڑوں میں کیا فیصلہ ہوا

راہیں سب اُن کے رد کنے کی بند ہو گئیں
سنتا ہوں میں کہ تم بھی رضامند ہو گئیں

ہاتھوں کو جوڑ کر علی اکبرؑ نے عرض کی
آماں نے بھی رضا میں دی اور پھوپھی نے بھی

رہبر اگر وہ بہو ہیں تو یہ دخترِ علیؑ
آقا سوال رد نہیں کرتے کبھی سچی

رویا جو میں تو ماں نے گلے سے لگا لیا
مرنے کا اذن دے کے پھوپھی نے جلا لیا

ماں نے کہا پسر کی فصاحت تو دیکھیے
نامِ خدا زبان کی طلاقت تو دیکھیے

زینبؑ یہ بولیں ذہن کی جودت تو دیکھیے
ہر بات میں ثبوتِ اجازت تو دیکھیے

کیا بات بھائی اُن کی بھلا بول چال کی
گویا زباں ہے صحفِ ناطق کے لال کی

رومال رکھ کے آنکھوں پہ بولے امام دیں
تم دو گی رخصت اُن کو مجھے یہ نہ تھا یقیں

سچ ہے اجل سے کچھ کسی انسان کا بس نہیں
آیا تھا اتنی عمر ہی لیکر یہ مہ جبیں

بیچا ہے روکنا جو یہ طالب رضا کے ہیں
اے بنتِ فاطمہؑ یہ کرشمے قضا کے ہیں

۷۔ عونؑ اور محمدؑ زخمی ہوکر قریب المرگ ہیں، حضرت علی اکبرؑ کی لاش اُٹھانے کیلئے جانا چاہتے ہیں، حضرت زینبؑ (عون و محمد کی ماں) انکو روکتی ہیں لاشیں گھر میں آتی ہیں۔ حضرت زینبؑ لوگوں کو رونے سے منع کرتی ہیں لیکن آخر ضبط نہیں ہوسکتا اور خود بین کرتی ہیں۔ ۷

گھر کے در خیمہ سے زینبؑ یہ پکاری
اولاد مجھے تم سے زیادہ نہیں پیاری

سر ننگے میں نکلونگی جو تم جاؤ گے ڈاری
بتلاؤ تو میں اُنکی ہوں عاشق کہ تمہاری

میداں کی طرف قاسمؑ بے پر بھی نہ جائیں
تلواروں میں عباسؑ دلاور بھی نہ جائیں

بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جدائی
اک دولتِ اولاد لٹائی تو لٹائی

سر پر مرے دنیا میں سلامت رہیں بھائی
کیا لٹ گیا وہ کونسی ایسی تھی کمائی

کیوں روؤں میں دنیا میں جو دلبند نہیں ہیں
کیا اکبرؑ و اصغرؑ مرے فرزند نہیں ہیں

یہ ذکر ابھی تھا کہ ستمگار پکارے
لوشاہ کی ہمشیر کے بیٹے گئے مارے

ٹکڑے کیا معصوموں کو تلوار و سنانے
وہ لوٹتے ہیں خاک پہ دو عرش کے تارے

پامالی کو اُن دونوں کے اسوار بڑھینگے
بچوں کے سر اب کٹ کے سناں پہ چڑھینگے

یہ سنتے ہی تھرانے لگے حضرت عباسؑ
گھبرا کے اُٹھے خاک سے شبیرؑ بصد یاس

سر کھولے ہوئے پیماں ڈلوا رہی جو بیبیاں پاس
سب نے کہا لو شہ کی بہن ہو گئی بے آس

ٹوٹا ہے فلک بنتِ شہنشاہ نجف پر
زینبؑ کو چلو لیکے بس اب ماتمی صف پر

ہے ہے کا اک شور ہوا رانڈ دنیں ہے پا
زینبؑ بھی ہٹی چھوڑ کے دروازے کا پردا

چلائی ارے چپکے رہو غل ہے یہ کیسا
بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں بیٹی ہو بیسا

ہے ہے نہ کرو صاحبو گھبرائیں گے شبیرؑ
پھر کون ہے زینبؑ کا جو مر جائیں گے شبیرؑ

باتیں یہ کہیں سب سے یہ سنبھلا نہ دلِ زار
تڑپا یہ کلیجہ کہ گری خاک پہ اک بار

واں لاشوں پہ روتے ہوئے پہنچے شہ ابرار
یہاں کوئی ساعت کہ ملے دو جگر افگار

کس عمر میں ہستی کا چمن چھوڑ رہے تھے
گودی کے پلے خاک پہ دم توڑ رہے تھے

رُخ زرد تھے اور خاک میں آلودہ تھی گیسو
جھک آئے تھے کٹ کٹ کے مہ نو سے دو ابرو

تلواروں سے ٹکڑے تھے وہ بلور سے بازو
مہتاب سی رہ چھاتیاں اور تیر سے پہلو

پھٹتا تھا جگر آنکھ نہ کھل سکتی تھی غش سے
ہونٹوں پہ زبانیں نکل آئی تھیں عطش سے

ٹکڑے ہوا سینہ میں دلِ سبطِ پیمبرؐ
ہے ہے کہا اور لاشوں سے لپٹے شہ صفدر

چھوٹے سے بڑے پر یہ کہا ہوش میں آکر
بالیں پہ حضور آئے ہیں چونکو تو برادر

مشتاق تھے تم سیدِ سجاد کو دیکھو

مرنے ہوئے دیدار شہنشاہ کو دیکھو

سُنکر یہ صدا غش سے جو چونکا وُہ انمکار
دونوں نے رکھا سر قدم شاہ پہ اک بار
اکبرؑ سے یہ کی عرض کہ اے شاہ کے دلدار
دشمن ہیں بہت قبلۂ عالم سے خبردار

ہم دونوں غلاموں کا نہ غم کھائیو بھائی
سر پیٹیں جو اماں انہیں سمجھائیو بھائی

حضرت کے جو رونے کی صدا خیمے میں آئی
رانڈوں نے اُدھر ماتمی صف گھر میں بچھائی
زینبؑ نے کہا ہائے غضب روتے ہیں بھائی
فضہ یہ پکاری کہ دوہائی ہے دوہائی

لو چاک گریبان کئے آتے ہیں شبیرؑ
معصوموں کی لاشوں کو لئے آتے ہیں شبیرؑ

بیٹھی صفِ ماتم پہ اُدھر شاہ کی خواہر
سیدانیوں نے اُٹھ کے اُدھر کھولدیے سر
لاشوں کو لئے آئے جو گھر میں شہِ صفدر
زینبؑ کے قریں بیٹھ گئے سر کو جھکا کر

فرمایا کہ لو لختِ جگر آئے تمہارے
لو دودھ اُنہیں بخشو پسر آئے تمہارے

دیکھا جو لہو بچوں کا چھاتی امنڈ آئی
نزدیک تھا مر جائے یداللہ کی جائی
پر فاطمہؑ کے صبر کی شان اُس نے دکھائی
یہ کہا یہ لگی میری کمائی

بچے مرے قرباں ہوئے احسان خدا کا
اے بی بی صدقہ ہے یہ شاہِ شہدا کا

رو کر بشہ والا نے کہا صدقے میں تم پر
دم بھر انہیں رو لو کہ یہ مہمان ہیں خواہر
بانو نے اشارہ کیا اے سبطِ پیمبرؐ
قربان گئی اب بس اب جایئے باہر

گر ضبط اسی طرح سے فرمائینگی زینبؑ
یہ ماتمِ اولاد ہے مر جائینگی زینبؑ

روتے ہوئے خیمے سے جو ڈیوڑھی پہ گئی شاہ
فرزندوں کو چلاتے لگی زینبؑ ذیجاہ

یہ نیند ہے کیسی کہ خبر تم کو نہیں آہ
صدقے گئی جاؤ شہِ کونین کی ہمراہ

زخمی ہوئے شبیرؑ تو جان اپنی میں دونگی
اچھا میں تمہیں دونوں سے مانجائے کو لونگی

لو نیچے کا ندھوں آج دھرو اے مری پیارو
تپتے ہوئے شبیرؑ کے ہمراہ سدھارو

گو پیاسے ہو دو دن کے پہ ہمت کو نہ ہارو
یہ خون میں ڈوبے ہوئے کپڑے تو اتارو

اٹھ بیٹھو میں صدقے گئی اتنا نہیں سوتے
اس طرح تو جاگے ہوئے دولھا نہیں سوتے

سونا ہے لڑائی کے دن ایسا کوئی غافل
بچو تمہیں کیا سن کے کہینگے شہِ عادل

دیکھو کہ تڑپتی ہے یہ ماں صورتِ بسمل
سلجھاؤ یہ زلفیں کہ الجھتا ہے مرا دل

کیا عشق میں ہو یہ سونے کا نقشا نہیں ہوتا
ایسا تو کوئی نیند کا ماتا نہیں ہوتا

مثال ۱۸ ۔ شبیر کو خبر ہوئی کہ امام حسین علیہ السلام معہ تمام خاندان کے اسکے گھر تشریف لائے ہیں اور وہ مہمانی کا سامان کرتی ہے اور وہ اپنے عزیزوں کو خوشخبری دیتی ہے،

یہ کہکے اس نے فرش کیا گھر میں سر بسر
مومن کے دل کی طرح مصفا ہوا وہ گھر

مسند بچھائی بہر شہنشاہ بحر و بر
تکیوں کو صاف کر کے لگایا اِدھر اُدھر

لہ یہ اشعار جذبات کے عنوان میں بھی داخل ہو سکتے ہیں ۱۲

کہتی تھی میرے گھر میں ابھی سے جو نور ہے
یہ آمدِ امامِ زمنؑ کا ظہور ہے

والاں ہے یہ شاہ کی خواہر کیواسطے
یہ نرم فرش ہے علی اکبرؑ کے واسطے
جھولے کی جا یہ ہے علی اصغرؑ کیواسطے
یہ گھر ہے شاہ دیں کی برادر کیواسطے

راحت سے شہ نشیں پہ امامِ زمن رہیں
حجرہ یہ اسلئے ہے کہ دولھا دلہن رہیں

کرسی کو لاکے جلد کسی جا بچھاتی تھی
تخفوں کو کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
سجدے میں بحرِ شکر کبھی سر جھکاتی تھی
گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ جاتی تھی

چہرے پہ اک خوشی تھی یہ دل بیقرار تھا
فرزند فاطمہؑ کا اُسے انتظار تھا

جا کر کبھی خواصوں سے کرتی تھی یہ کلام
کھانا پکاؤ جلد کہ آتے ہیں اب امام
بھر بھر کے آب سرد کی رکھدو ہوا میں جام
لبریز آب گرم کے کردو سبو تمام

پردیسیوں کو خیر سے جب گھر میں لاؤنگی
ہاتھوں سے اپنے اُون سبھوں کے دھلاؤنگی

ہمسائیوں سے کہتی تھی ہنس ہنس کے بار بار
اب کیجیو زیارتِ سلطانِ نامدار
ہے باغ فاطمہؑ پہ عجب حسن کی بہار
رشکِ ریاضِ خلد ہے ایک ایک گلعذار

سب نونہالِ گلشنِ دیں لاجواب ہیں
قدسرو باغِ حسن ہیں رُخ آفتاب ہیں

شمشادِ بوستانِ پیمبرؐ کو دیکھیو
سروِ ریاضِ حضرتِ شبرؑ کو دیکھیو

کیا نوجوان شہ کے برادر کو دیکھیو
سب ایک سمت تم علی اکبر کو دیکھیو

ہوگا کبھی حسن نہ ملک کا نہ حور کا
جلوہ ہے اُس جری میں محمدؐ کے نور کا

خالق رکھے اُسے صد و بیسی سال برقرار
نامِ خدا ہے شادی کی قابل وہ گلعذار

بہنیں فدا ہیں باپ تصدق ہیں ماں نثار
سر پر پھپھو بھی پیار سے گیسو کھے ہیں چار

چہرے کی آگے نیّرِ تاباں بھی ماند ہے
عالم کی روشنی ہے اندھیری کا چاند ہے

اب خیریت سے گذریگا اٹھارواں سال
شادی کرینگی بیٹے کی بانوئے خوشخصال

زینبؑ کو اسکے بیاہ کا ارمان ہے کمال
ہر دم یہی دعا ہے کہ دولھا بنے یہ لال

آتی ہیں نسبتیں حلب و شام و روم سے
شادی خدا جو چاہے تو ہوویگی دھوم سے

جب ڈھل گئی اُسے انہیں باتوں میں دوپہر
شوہر سے پھر یہ کہنے لگی وہ نکو سیر

اب تک نہ آئے گھر میں شہنشاہِ بحر و بر
اُترے کہاں کسی سے مفصل سُنی خبر

بستی سے ساتھ لے کے ہر اک اپنے بھائی کو
جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو

کہیو مری طرف سے یہ تو چوم کر قدم
لونڈی کو سرفراز کر دیا شہِ امم

کرتے ہیں اغنیا غربا پر سوا کرم
اب بے حضور چین نہیں مجھکو ایک دم

کچھ آج ہے تپش سی دلِ بیقرار میں
آنکھیں سپید ہوگئی ہیں انتظار میں

قربان ہوگئی مرا گھر کچھ نہیں ہے دُور
خاصہ تناول آن کے اس جا کریں حضور
ہم لوگ مشتِ خاک ہیں حضرت خدا کی نور
ہوگا یہ کوہ آپکے آنے سے رشکِ طور

کہنا حضور راہِ ہدایت کی شمع ہیں
پروانے یاں سحر سے زیارت کو جمع ہیں

عرصہ ابھی ہے آپکے آنے میں کچھ اگر
آنے میں کیوں حرم کے ہوئی دیر اسقدر
ڈیوڑھی پہ بندوبست ہے باشاہ بحر و بر
گرد وار کھی ہیں بیس قناتیں اِدھر اُدھر

محمل میں گھنٹی ہونگی زہرا کی پیاریاں
عباسؑ لے کے آئیں زنانی سواریاں

رزمیہ

رزمیہ شاعری اگرچہ واقعہ نگاری ہی قسم کی ہے لیکن وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے اس کیلئے جداگانہ عنوان درکار ہے،

اردو، بلکہ عربی میں بھی رزمیہ شاعری کو چنداں ترقی نہیں ہوئی، عربی میں مثنوی سرے سے مفقود ہے، اور مسلسل واقعات مثنوی کے سوا، اور کسی صنف میں ادا ہی نہیں ہو سکتے، شعرائے جاہلیت، لڑائی کے جستہ جستہ واقعات قصائد میں ادا کر لیا کرتے تھے، لیکن اس تمام شاعری میں، کوئی مسلسل رزمیہ نظم ۵۰ شعروں کی بھی نہیں مل سکتی،

فارسی میں شاہ نامہ اور سکندر نامہ کو الگ کر لیا جائے، تو کچھ باقی نہیں رہتا لیکن ایک شاہ نامہ ہزاروں کتابوں پر بھاری ہے۔ اسلئے فارسی شاعری کا رتبہ اس

حیثیت میں، عربی سے بڑھا رہا۔ اور اس کو خود زبان دانانِ عرب نے تسلیم کیا چنانچہ ابن الاثیر نے مثل السائر میں صاف لکھدیا کہ عربی زبان باوجود اس قدر وسعت اور مایہ داری کے شاہنامہ کی نظیر نہیں پیش کر سکتی،

اردو میں بے دیکر، میر تقی ہوس کے چند اشعار ہیں جو نوفل اور لیلیٰ کے قبیلہ کی لڑائی کے موقع پر لکھے ہیں اس کا نمونہ یہ ہے ؎

شانوں سے گذر کے رمح چالاک		تھے ہوش رُبائے مار ضحاک	

مرثیہ میں، میر ضمیر نے رزمیہ کی ابتدا کی، لیکن وہ بالکل نقشِ اولین تھا میر انیس نے جس طرح اس صنف کو کمال کے درجہ تک پہنچایا اُس کے لحاظ سے، اردو شاعری گو فارسی کے برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی لیکن عربی سے کسی طرح پیچھے نہیں،

رزمیہ شاعری کا کمال، امور ذیل پر موقوف ہے سب سے پہلے لڑائی کی تیاری معرکہ کارزور شور، تلاطم، ہنگامہ خیزی، ہلچل، شور وغل، نقاروں کی گونج، ٹاپوں کی آواز، ہتھیاروں کی جھنکار، تلواروں کی چمک دمک، تیروں کی لچک، کمانوں کا کڑکنا تقیبوں کا گرجنا، ان چیزوں کا اس طرح بیان کیا جائے کہ آنکھوں کے سامنے معرکۂ جنگ کا سماں چھا جائے۔ پھر بہادروں کا میدانِ جنگ میں جانا، مبارز طلب ہونا، باہم معرکہ آرائی کرنا، لڑائی کے داؤ پیچ دکھانا، ان سب کا بیان کیا جائے، اسکے ساتھ، اسلحۂ جنگ، اور دیگر سامانِ جنگ کی الگ الگ تصویر کھینچی جائے پھر فتح یا شکست کا بیان کیا جائے اور اس طرح کیا جائے کہ دل دہل جائیں، یا طبیعتوں پر اُداسی اور غم کا عالم چھا جائے۔

فردوسی کے ہاں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں، مثلاً وہ معرکۂ جنگ کا سماں اسطرح

کھینچتا ہے ۵

جہاں لرزلرزاں شد و دشت و کوہ — زمیں شد ز نعل ستوراں ستوہ
برآمد ز ہر سو ز لشکر خروش — ہمے پیل را زان بدرید گوش
ز بس نیزہ و گرز و گوپال و تیغ — تو گفتی ہمہ ژالہ بارد ز میغ
بلند آسماں چوں زمیں شد ز خاک — ز ہر سو ہمے برشدہ چاک چاک
درخشیدن تیغ ہائے بنفش — ازاں سایہ کاویانی درفش
تو گفتی کہ اندر شب تیرہ چہر — ستارہ ہمے برفشاند سپہر
سیہ شد ز گرد سپہ آفتاب — ز پیکان پولاد و پر عقاب
دل کوہ گفتی بدرد ہمے — زمیں با سواراں بپردہ ہمے
تو گفتی کہ ابرے برآمد سیاہ — ببارید خوں اندراں رزمگاہ
ز گرد سیاہ روشنائی نماند — ز خورشید شب را جدائی نماند
ز جوش سواران و ز خم تبر — دل کوہ خارا برآورد سر
زمیں شد ز نعل ستوراں ستوہ — ہماں کوہ و دریا شد و دشت کوہ
ز بس نعرہ و نالہ کرنائے — ہمے آسماں اندر آمد ز جائے
سناں ہائے رخشاں و تیغ سراں — درفش از بر و زیر گرز گراں
بجوشید دشت و بجنبید کوہ — ز بانگ سواران ہر دو گروہ
ز آہن زمیں بود و از گرز میغ — ستارہ سناں بود و خورشید تیغ
زمیں لالہ گوں شد ہوا نیلگوں — برآمد ہمے موج دریائے خوں

اس کے مقابلہ میں میر انیس کا رزمیہ دیکھو ۵

ہنگامۂ جنگ

نقارۂ وغا پہ لگی چوب یک بیک
اُٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہُوا ملک
قرنا پھُنکی کہ گونج اُٹھا دشت و دو تک

شورِ دُہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گو بچتا تھا وہ سب وادیٔ نبرد
گردن ہیں مثلِ شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخ چار میں پہ رُخِ آفتاب زرد
ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد

گرمیٔ ہجومِ فوج سے وہ چند ہو گئی
خاک اسقدر اُڑی کہ ہوا بند ہو گئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہُوا مٹی کا رنگ زرد
اُٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلہ میں گرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے زرد

گرمی سے رن کے ہوش اُڑے وحش و طیر کے
شیر اُس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در
جنّات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
دنیا میں خاک اڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر

اندھیر ہے، اُٹھی برکت اب جہان سے
لو مل گیا زمین کا طبق آسمان سے

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد
ہلتے تھے کوہ، کانپتا تھا وادیٔ نبرد
تھا دن بھی زرد، دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد
خورشید چھپ گیا، یہ اُٹھی کربلا میں گرد

اک تیرگی غبار سے تھی چشم مہر میں
ٹاپوں پڑے ہوئے تھے محیطِ سپہر میں

فوج کی تیاریاں اور سامان

اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل
خنجر وہ جنگی آب میں تھی تلخیٔ اجل

تھے برچھیوں کی صورت مقراض پھل پہ پھل
وہ گرز جن کے ڈر سے گری دیو منہ کے بل

دو دو تبر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں تھے بچھے ہوئے حلقے کمند کے

وہ دھوم طبل جنگ کی وہ بوق کا خروش
تھرّائی یوں نہیں کہ اُڑے آسماں کے ہوش

کر ہو گئے تھے شور سے کر وبیوں کے گوش
نیزے ہلا کے نکلے سواران درع پوش

ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سواران شوم کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

حد سے فزوں ہے کثرتِ افواج نابکار
ہر سمت ہے سناں پہ سناں مثل کارزار

نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ ہے تیغ آب دار
ہر صف میں ہے سپر پہ سپر مثل لالہ زار

پیکاں بہم ہیں جیسے ہوں گل کھلے ہوئے
گوشوں سے ہیں کمانوں کے گوشے ملے ہوئے

دریا کی طرح لشکر کیں مارتا ہے جوش
ھَل مِن مُبارِز کا ہر اک صف سے ہے خروش

نیزے ہلا رہے ہیں جوانانِ درع پوش
چلّے کھچے ہوئے ہیں کمانوں کے تا بگوش

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی ہیں
نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں

نیزے تلے ہوئے ہیں سناں چمکتی ہیں
ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں

سنگیں دلوں میں ہاتھ میں پتھر اُٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرز گراں، سر اُٹھائے ہیں

سپاہیوں کی آمادگی جنگ ؎

تنتا ہُوا بڑھا کوئی قبضہ کو چوم کے
بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے

چتون کسی کی شور دل سے بگڑ گئی
مُنہ سُرخ ہو گیا، شکن ابرو پہ پڑ گئی

نکلا کوئی سمند کو زانو میں داب کے
غصہ سے رہ گیا کوئی ہونٹو کو چاب کے

ولہ

پاس ادب سے شاہ کی صف بڑھ کے تھم گئی
پٹری ہر اک سوار کی گھوڑی پہ جم گئی

حملہ کا زور شور، اور فوجوں کی ہل چل ؎

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے
اُڑنے لگے شرر دم خارا شگاف سے

بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے
صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے

طبقے فلک کے صورت گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کی دامن سے مل گئے

لرزہ تھا تخت و فوق و جنوب و شمال میں
سُکّان غرب و شرق تھے بیم زوال میں

مضطر تھے شش جہت کی مکیں ایک حال میں
غُل تھا کہ گھر گئے غضب ذوالجلال میں

شہ کا غضب نمونۂ قہر الٰہ تھا
تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

جنگل میں تھی علم جو وہ تیغ شرر فشاں
تھرّا کے آسمان میں چھپتا تھا آسماں

غار اژدروں سے چھٹ گئے شیروں سے بیشتاں
برپا تھا بر و بحر میں اک شور الاماں

مانند موج مچھلیوں میں اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک سنگ کا پانی میں آب تھا

اُٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور
مردے دہل کے چونک پڑے سب میان گور
چلائے گرگ و شیر و غزالاں و مار و مور
ہے بازوئے حسینؑ میں دست خدا کا زور

اُلٹے ہیں مثل شیر خدا آستین کو
اے کردگار عرش بچالے زمین کو

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر
تھیں موج کی طرح سب ادھر کی صفیں ادھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور
پانی میں تھی نہنگ، اُبھرتے نہ تھے مگر

فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارہ کو چھوڑ کے

تھا شش جہت میں غل کہ یہ ہے وقت انقلاب
اُلٹے گا اس زمیں کا ورق ابن بوتراب
اس شیر پر نہ ہوگی کوئی فوج فتحیاب
بس اب بنائے عالم امکاں ہوئی خراب

حملہ غضب ہے بازوئے شاہ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمین کے جہاز کا

ملتی تھی جائے امن نہ زیر فلک کہیں
غل تھا کہ مل نہ جائے سما سے سمک کہیں
جنات بیحواس کہیں تھے ملک کہیں
سایہ کہیں تھا، تیغ کہیں تھی چمک کہیں

پانی سے جل بجھا تھا کوئی کوئی نار سے
گرتی تھیں تین بجلیاں اک ذوالفقار سے

پریوں سے قاف چھوٹ گیا، اور جنوں سے گھر
شیروں سے دشت، گرگ سے بن، اژدروں سے در

شاہین و کبک چھپ گئے اکبا ملا کے سر
اڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور

سمٹے پسار منہ کو جو دامن سے ڈھانک کے
سیمرغ نے گرا دیئے پر کانپ کانپ کے

فوجوں کی ابتری اور ہل چل

گرتی تھی برق تیغ جو ہر دل ادھر ادھر
شبدیز تھا کہ پھر رہی تھی کل ادھر ادھر

سمٹے ہوئے تھے ڈھال و بکتر ادھر ادھر
بھاگڑ تھی قلب فوج میں ہلچل ادھر ادھر

ہر جا تنوں کے ڈھیر سروں سے بلند تھے
بھاگیں کہاں اگر نہ کے کوچے تو بند تھے

تیغیں سپر کے ساتھ کٹیں خود کے ساتھ
ہلچل یہ تھی کہ باپ نہ پوچھے پسر کے ساتھ

سینہ کمر کے ساتھ کٹا، دل جگر کے ساتھ
اس معرکہ میں چھوٹ گئے عمر بھر کے ساتھ

بھاگے شریر خلعت و منصب کو چھوڑ کر
جانیں روانہ ہو گئیں قالب کو چھوڑ کر

سر ہنگ شاہ ٹھوکریں کھا کھا کے مر گئے
کتنے جواں سموں کے تلے آ کے مر گئے

جو بچ گئے ادھر سے ادھر جا کے مر گئے
پس پس کے سرمہ ہو گئے ٹکرا کے مر گئے

ہلچل نے استخوان بدن چور کر دیئے
بیٹوں نے پاؤں باپ کی چھاتی پہ دھر دیئے

تھا الاماں کا شور پریشاں تھی اہل شر
ماتھے علم رگڑتے تھے جھک جھک کے خاک پر

تیغوں کے پیچھے ڈر کی چھپی تھی ہر اک سپر
پرچم نے بال کھولے تھے فریادیوں نے سر

دانتوں میں حس ہراس سے تھی ہر جوان کے

چادر ہلا رہے تھے پھریرے نشان کے

بے رُوح کمانیں تیروں سے، چلّے کمان سے دور
مُرغانِ تیر سہمے ہوئے آشیاں سے دور
برچھے سے پھل گرے ہوئے، تیر بساں سے دور
پیروں سے عقل دور، تہوّر جواں سے دور

تیغوں کی کچھ خبر تھی نہ ڈھالوں کا ہوش تھا
نیزہ ہر اک سوار کو اک بار دوش تھا

درپے تھی سر کشوں کی جو وہ تیغ جانستاں
گوشوں سے تھی بلند صدائے اماں اماں
ترکش سے تیر بھاگتے تھے، تیر سے کماں
گردن سے سر، رگوں سے لہو، اور تنوں سے جاں

یارا عقاب تیز کو پرواز کا نہ تھا
رن میں کہیں نشان قدر انداز کا نہ تھا

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں
چلّے کہیں تھے شست کہیں تھی کماں کہیں
نیزے کہیں تھے، ڈانڈ کہیں تھی سناں کہیں
جمدھر کہیں، کمند کہیں، برچھیاں کہیں

اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

وہ گھاٹ باڑھ اور وہ اُس کی چمک دمک
کانپی کبھی زمیں، کبھی تھرّا گئے فلک
شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک
ہر ضرب میں سما سے نلاطم تھا تا سمک

کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاؤ زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سپاہ لعیں ہٹی
یہ صف سوئے یسار وہ سوئے یمیں ہٹی
سہمے جبال، نہر کہیں سے کہیں ہٹی
دہشت سے آسماں ہوا اونچا زمیں ہٹی

بھاگڑ پڑی کہ ایک سے اک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتی گردوں پہ چڑھ گیا

نعرہ جُدا، صدائے بگیر و بدہ جُدا
بکتر جُدا، زمین پہ ٹکڑی، زرہ جُدا

گوشے کمان سے دور تھے، گوشوں سے زہ جُدا
نیزوں کو دیکھئے تو گرہ سے گرہ جُدا

اللہ رے فرق، گردن و سر بھی بہم نہ تھے
کشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تیغوں میں دم نہ تھے

مغفر نہ سر کے پاس، نہ خنجر کمر کے پاس
قبضہ کے پاس تیغ نہ دستہ تبر کے پاس

بیٹے کے پاس باپ، نہ بیٹا پدر کے پاس
کڑیاں زرہ کے پاس نہ دامن سپر کے پاس

نیزے نہ تھے سنان نہ پرچم نشان پر
پیکان نہ تیر پر تھا، نہ چلہ کمان پر

معرکہ آرائی اور فنون جنگ کا اظہار قدیم زمانہ میں جنگ کا دستور تھا کہ عام لڑائی سے پہلے دونوں طرف سے، پہلے ایک ایک شخص میدان میں نکل کر حریف سے معرکہ آرا ہوتا تھا اس بنا پر تمام مرثیہ گویوں نے اس قسم کی معرکہ آرائیاں بیان کیں ہیں لیکن مرزا دبیر وغیرہ یہ واقع اس طرح لکھتے ہیں کہ یہ نہیں اندازہ ہوتا کہ حریفوں نے فن جنگ کے کیا کیا ہنر دکھائے بخلاف اسکے میر انیس اسکو اسطرح ادا کرتے ہیں کہ گویا فن جنگ کا بڑا ماہر لڑائی کے داؤں پیچ بتا رہا ہے، چونکہ عرب میں سب سے پہلے لڑائی کی ابتداء رجز سے ہوتی تھی اسلئے پہلے ہم رجز کا اندازہ دکھاتے ہیں۔

رجز عرب میں سب سے پہلے، حریف میدان میں نکل کر رجز پڑھتا تھا یعنی اپنی شجاعت اور دلیری کا خود اظہار کرتا تھا، اس بنا پر میر انیس نے جا بجا رجز لکھا ہے لیکن چونکہ

امام حسین علیہ السلام کی زبان سے پہلوانی کا اظہار، اُن کے رتبہ کی شایان نہ تھا اسلئے اکثر رجزوں میں پہلوانی اور بہادری کے بجائے فضیلت اور شرف کا اظہار کیا ہے مثلاً ؎

میں ہوں سردار شباب چمن خلد بریں	میں ہوں انگشتر پیغمبر خاتم کا نگیں
میں ہوں خالق کی قسم دوش محمد کا ممیں	مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں

ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہو جائے

پھر یہ بیان کر کے کہ جناب رسول اللہ صلعم اور جناب امیر و حمزہ سید الشہدا کے تمام تبرکات مجھی کو وراثت میں ملے ہیں، فرماتے ہیں ؎

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار	یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار
پر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ جوہر دار	کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پر ہوں سوار

کس کا یہ خود ہے، یہ تیغ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

لیکن عام رجز کے قاعدہ کے لحاظ سے، بعض بعض جگہ شجاعت اور زور و قوت کا بھی اظہار کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بخشا ہے مجھ کو حق نے شہ لافتیٰ کا زور	اس دست مرتعش میں ہے دست خدا کا زور
ہے انگلیوں کے بند میں خیبر کشا کا زور	پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور

اُلٹوں فلک کو پل میں، جو ہو قصد انقلاب کا
جس طرح ٹوٹ جاتا ہے ساغر حباب کا

آگے بڑھوں جو تیر کو چلّہ میں جوڑ کے
بھاگیں خطا شعار کمانوں کو چھوڑ کے

بیکار کردوں شیر کا پنجہ مروڑ کے
پٹکوں زمین پر در خیبر کو توڑ کے

الٹوں طبق زمین کے یوں جھک کے زین سے
جس طرح جھاڑ دیتے ہیں گرد آستین سے

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
آئے غضب خدا کا اُدھر رُخ جدھر کروں

بے جبرئیل کار قضا و قدر کروں
انگلی کی اک اشارے میں شق القمر کروں

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ پھیر کے ڈھال آفتاب کی

یہ تیغ سر پہ گر کے ٹھہرتی ہے زین پر
جب ہاتھ اُٹھائے برق گری ہے زمین پر

خیبر میں کیا گذر گئی روح الامیں پر
کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

گھوڑے پر سوار ہونا

لو اب سوار ہوتے ہیں عباس نامور
لو دامن قبا نے لیا بوسہ کمر

لو ہٹ کے ہاتھ آپ نے رکھا رکاب پر
لو آفتاب خانۂ زیں میں ہے جلوہ گر

برچھا لیا سمند میں زانو کو داب کے
لو دو ہلال بن گئے حلقے رکاب کے

دو حریفوں کی معرکہ آرائی اور فنون جنگ

فردوسی کا یہ بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لڑائی کے تمام جزئیات حالوں پر، اور فنون جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے؛ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ سرسری اور معمولی باتوں کے سوا، لڑائی کی ہر قسم کے کرتب نہیں دکھاتا سب سے بڑا سین جو اُس نے دکھایا ہے وہ رستم اور اشکبوس کا معرکہ ہے اس

موقع کے اشعار یہ ہیں ؎

خدنگے برآورد پیکاں چو آب
نہادہ بر دچادر زیر غفاب

بمالید چاچی کماں را بدست
بہ چرم گوزن اندر آمد شکست

ستوں کرد چپ پا و خم کرد راست
خروش از خم چرخ چاچی بخاست

چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس
سپہر آن زماں مرگ او داد بوس

چو پیکاں ببوسید انگشت اوے
گذر کرد از چہرۂ پشت اوے

ان اشعار میں تیر اندازی کا وہی معمولی طریقہ ادا کیا ہی، البتہ نہایت شاندار اور پُر زور الفاظ میں ادا کیا ہی لیکن میر انیس، لڑائی کے ہر قسم کے کرتب اور ہنر اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی، ملاحظہ ہو ؎

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سی نیزہ کو دی تکان
چمکی ادی تو برق پکاری کہ الاماں

اک بند باندھکر جو فرس سے کہا کہ ہاں
ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں

پل کیا کرے کہ زور ہی معذور کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سی وہ اٹھی لپٹ گیا

بھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر
قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ، پہ را بچا کے سر

دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر
جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر

نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب
قبضہ میں لی کماں کیانی یہ صدغضب

چلہ میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب
تیوری چڑھائی قاسم نوشاہ زیبا تب

تیرِ نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّہ اُتر گیا

ہر بار جانبین سے ہوتے تھے وار رد
تھا حرب و ضرب میں وہ شقی بھی بلائے بد
جب بڑھ کے وار کرتا تھا وہ بانیِ حسد
کہتا تھا بازوئے شہِ دیں یا علیؑ مدد

یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جھول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بد خصال
جھپٹا مثالِ شیر درندہ حسینؑ کا لال
گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا بصد جلال
اتنے بڑھے کہ لڑ گئی اسکی سپر سے ڈھال

اوجھڑ لگی کہ ہوش اُڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیئے سر پر سمند کے

عباسؑ نامدار نے پہلو سے دی صدا
اب جانے دیجیو احسنت مرحبا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا
سنتے ہی یہ فرس سے فرس کو کیا جدا

گھوڑا ابھی اس طرف کو اُدھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر پہ ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

ایک اور موقع ۵

نیزے ہلے، وہ چل گئیں چوٹیں کہ الاماں
ہر طعن قہر کی تھی، قیامت کی تر زباں
چنگاریاں اُڑیں جو سناں سے لڑی سناں
دو اژدھے گھتے تھے نکالے ہوئے زباں

پھیلے شرر پرندوں کی جانیں ہوا ہوئیں
شمعوں کی تھیں لویں کہ ملی اور جدا ہوئیں

ان کا نہ اک وار نہ اس کے ہزار بند
بڑھ بڑھ کے کھول دیتا تھا یہ شہسوار بند
کیا دو نیزہ بازی میں تھا بار بار بند
چوٹوں سے نیلگوں تھے جفا جو کے چار بند

خالی گئی نہ فرق کی نہ دست و پا کی چوٹ
کھلتی بھی ہے بندھی ہوئی مشکل کشا کی چوٹ

ڈوبی گرہ میں نیزۂ ظالم کی جب سناں
گھوڑا اڑا کے ہاتھ کو اکبرؑ نے دی تکاں
اللہ رے زور اٹھ گیا گھوڑے سے یہ پہلواں
دست شقی سے چھوٹ گئی ڈانڈ ناگہاں

نیزے کے ساتھ شور اٹھا اس گروہ سے
لو اژدہے کو لے گیا سی مرغ کوہ سے

ظالم نے ڈھال دوش سے لی اور کمر سے تیغ
بدلا تھا اس نے ٹھاٹ کہ چمکی ادھر سے تیغ
دو چار بار ڈوب کے نکلی سپر سے تیغ
چلنے میں گھٹتی بڑھتی تھی کس کس ہنر سے تیغ

ولہ

چمکی سپر کے پاس کبھی برق کی مثال
شانے پہ آئی سینہ پہ لی جب شقی نے ڈھال
سر کو بنا کے کاٹ گئی وہ زرہ کا جال
چوٹیں کڑی پڑی تھیں کہ مضطر تھا بد خصال

روکے کسے؟ جواب کسی دے؟ کدھر پھرے؟
بجلی کے ساتھ ساتھ کہاں تک سپر پھرے

چمکی جو تیغ، ڈھال وہ لایا قریب سر
اک برق سی گری کہ دو پارہ ہوئی سپر
مغفر سے سر میں تھی، سر و گردن سے صدر پر
سینہ سی جب بڑھی تو ہوا تب وہ باخبر

سب نشۂ غرور جوانی اتر گیا
تلوار تھی کہ حلق سے پانی اتر گیا

ایک اور موقع ۵

تولا شفقی نے سنتے ہی یہ گرز گاؤ سر
اکبر نے دوش پاک سے لی ہاتھ میں سپر
آیا اُدھر سے گرز ادھر سے چلا تبر
دو ہو گیا عمود مثالِ خیار تر

گرز اس طرح نکل گیا نیچے سے چھوٹ کے
سمجھے یہ سب زمیں پہ گرا ہاتھ ٹوٹ کے

بھالا سنبھالا دشمنِ ایماں نے مل کے ہاتھ
نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ
پہلے ہی بک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ
بڑھنا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا چلکے ہاتھ

کم تھے نہ یہ بھی زور میں گرده زیاد تھا
نیزے کی بند بند کا توڑان کو یاد تھا

رکھ کر تبر نیام سے لی تیغ شعلہ ور
ٹھہرا کے خود اماں نے صدا دی کہ الحذر
بھالے کی ہاتھ بھول گیا سب وہ خیرہ سر
یہ بھی اُدھر تھے پھرتا تھا نیزہ جدھر جدھر

جاتا کدھر یہ تیغ سے جائے اماں نہ تھی
دیکھا جو غور سے تو سناں کی زباں نہ تھی

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند
کھولے تمام نیزہ بیداد گر کے بند
پھینکی شفقی نے فرق پہ جھلا کے پھر کمند
سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند

گردش تھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ ہٹ گئے
حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے میں کٹ گئے

ہٹ کر خطا شعار نے جوڑا کماں میں تیر
تیر افگنی میں شہرہ آفاق تھا شریر
سرکش خدنگ مرگ سی کینہ کر ہو گوشہ گیر
چلہ کٹا کمان کا ہے تیغ بے نظیر

قربان زور ضربت نصرت نشان کے
کھل کر قبا پہ بندھ گئے بازو کمان کے

خادم نے تیر جوڑ کے دوسری کماں
نیزہ اُٹھا کے شیر نے آواز دی کہ ہاں
سیدھا اِدھر اُٹھی تھی کہ چلکی اُدھر سناں
بھالے کی نوک جھونک نئی تھی نئی نکاں

سہماں یہ دل کہ بن گئی موذی کی جان پر
ناوک نہیں یہ تھا تو کماں آسماں پر

ایک اور موقع پر ؎

پیہم ہوئیں نکاں یہ نکانیں جو یکدگر
ظالم کبھی اُدھر تھا تو حضرت کبھی اُدھر
کس نوک جھوک سے وہیں نیزے کو پھیر کر
فرزند شیر حق نے دکھایا عجب ہنر

ظالم پہ آسماں سے بلا ناگہاں گری
دو نیزہ اُڑ کے زیں پر سناں گری

چلّہ میں رکھ کے تیر بڑھے قبلۂ امم
اک ہاتھ راست کر کے کیا دوسرے کو خم
کچھ کہہ کے گوش شہ میں چلا تیر تیز دم
آواز دی کماں نے زہے شاہ باکرم

چلّہ تو شست شاہ زمن سے نکل گیا
واں تیر دل کو توڑ کے سن سے نکل گیا

گھوڑا فردوسی کے ہاں گھوڑے کی تعریف میں جستہ جستہ دو چار شعر پائے جاتے ہیں لیکن متاخرین نے اس مضمون کو بہت وسعت دی اور مبالغہ کو حد سے بڑھا دیا ہے پہلے عبدالواسع جبلی نے ایک قصیدہ کی تشبیب، گھوڑے کی مدح سے کی ؎

اے بہ بالا ہمچو آتش دے سوئے پستی چو آب
خاک وصفی در و رنگ و باد رنگی در شتاب

گر کنی پویہ بنا شد ابر با تو ہم عناں	گر پری حملہ بنا شد برق با تو ہم رکاب

مبالغہ ملاحظہ ہو ؎

از جبل پنہاں شوی در سایہ پرہ پشتہ	وز نہر جولاں کنی، در گوشہ چشم ذباب

"ایک شعر کے بعد لکھتے ہیں کہ جب تو بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے، یا پستی سے بلندی پر چڑھتا ہے تو ؎

نسبتے داری ہمانا با قضائے آسماں	قربتے داری ہمانا با دعائے مستجاب

عرفی نے بھی ایک قصیدہ گھوڑے کی مدح میں لکھا ہے ؎

اے طعن فلک نوشتہ بر سُم	وے زلف صبا بریدہ از دم
بر غنچہ سبک روے بدانساں	کش خندہ بزاید از تبسم
تازی بہ لب فسانہ پرداز	زاں گونہ کہ نشکنی تکلم

ایک اور قصیدہ میں لکھتا ہے ؎

آں سبک سیر کہ گر گرم عنانش سازی	از ازل سوئے ابد وز ابد آید بہ ازل
قطرہ ہا کش دم رفتن چکد از پیشانی	شبنم آساش نشیند گہ رجعت بہ کفل
گر سر خصم تو بندد بہ پایش دم نزع	تا قیامت بہ گلویش نہ رسد دست اجل

زلالی لکھتا ہے ؎

ز جستن جستن او سایہ در دشت	چو زاغ، آشیان گم کردہ می گشت

یعنی گھوڑا اس طرح جنگل میں اُڑتا پھرتا تھا کہ خود اس کا سایہ اُس کو یوں ڈھونڈھتا پھرتا تھا جس طرح کوا اپنے گھونسلے کو ڈھونڈھتا پھرے۔

اُردو میں مرزا سودا نے کہا ؎

روبرو سے اگر آئینہ کے اُس گلگوں کو
پھینک دے لیکے کبھی شرق سے تو غرب تلک
اتنے عرصہ میں پھر آئے تو اُسے باور کر
عکس بھی آئینہ سے ہوئے نہ بائی منفک

مرزا دبیر صاحب فرماتے ہیں ع سرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا۔
ان تمام اشعار کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ فارسی اور اُردو میں جو کچھ گھوڑے کی مدح میں لکھا گیا، وہ صرف ناممکنات کے افسانے تھے، کسی نے یہ نہیں کیا کہ گھوڑے کے اصلی خدوخال، ڈیل ڈول، چہرہ مہرہ، چال پھر، آؤ بھاؤ کا نقشہ دکھاتا میر انیس صاحب بھی اگرچہ مذاق عام کی پیروی سے اکثر بہکے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں
ع آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو ۵

تنکی سے آسماں کی خفا یہ سمند ہے
کیونکر اُڑے، پری ہے کہ شیشہ میں بند ہے

تاہم ان کا اصلی جوہر بھی ہر جگہ نمایاں ہے، ملاحظہ ہو ۵

باریک جلد وہ کہ نظر آئے تن کا خون
گنڈی کو دیکھ کر مہ نو ہوئے سرنگوں
رفتار میں وہ سحر کہ پریوں کو ہو جنوں
غنچے بھی کچھ بڑھے ہیں کنوتی کو کیا کہوں

قربان ہزار جان فرس بے نظیر پر
پیکان دو چڑھی ہوئے ہیں ایک تیر پر

نازک مزاج، وخوش قد و طناز سربلند
وہ پیش و پس، وہ سم وہ کنوتی وہ جوڑ بند
کوتاہ، وگرد، وصاف، کنوتی، کمر کفل
ولہ کیا خوشنما کشادگی سینہ و بغل
وہ نخوتھنی، وہ اُبلی ہوئی آنکھ پال، وہ یال
ولہ گویا کھلے تھے حور کے گیسو پری کے بال
وہ جلد، وہ دماغ، وہ سینہ، وہ سم، وہ چال
ولہ دم میں کبھی ہما، کبھی قیصم، کبھی غزال
وہ قصر آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا

دو پر خدا اگر اُسے دیتا براق تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند
سُم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند
سانچے میں تھے جو ڈھلے ہوئے سب اسکی جوڑ بند
نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم سربلند

پتلی جدھر سوار نے پھیری وہ مڑ گیا
اُترا براق بن کے پری ہو کے اُڑ گیا

جرأت میں رشک شیر تو ہیکل میں پیل تن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطر زن
پوئی گیو فت کبک دری جست میں ہرن
بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن

سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

افزوں ہے زلف حور سے خوشبو ایال کی
پریاں خرام ناز میں شاگرد چال کی
دیکھیں تو لین ملائیں سدا بال بال کی
غصہ میں جست شیر کی شوخی غزال کی

وہ حسن تن پہ ساز کا جوبن یراق کا
دُلدُل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

غصہ میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھئے
جوبن میں جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھئے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھئے
تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھئے

وہ ٹھوٹھنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں آہو چشم جسکو دیکھکر

ع وہ شوخیاں فرس کی، وہ سرعت، وہ آؤ جاؤ،

گھوڑے کے غیظ کی تصویر ہے

مانند شیر غیظ میں آیا وہ پیل تن
آنکھیں اُبل پڑیں صفتِ آہوئے ختن
ماری زمیں پہ ٹاپ کہ لرزا تمام بن
غل پڑ گیا کہ گھوڑی پہ بھی لو چڑھا ہے رن

میخیں زمیں کی اُسکی تگاپو سے ہل گئیں
دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے ہل گئیں

گھوڑے کی تیز روی اور چل پھر ۵

سمٹا جما اُڑا، ادھر آیا اُدھر گیا
چمکا پھرا، جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو، پرے سے گذر گیا

گھوڑوں کا تن بھی تاپ سے اُسکے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

پھرتا تھا کیا صفوں میں فرس جھوم جھوم کے
سرعت بلائیں لیتی تھی منہ چوم چوم کے
پامال تھے پرے سپہ شام و روم کے
غل تھا یہ غول میں ہے سپہر سعد شوم کے

رخش ایسا روم و رے میں نہیں، شام میں نہیں
یہ شوخیاں نوابلقِ ایام میں نہیں

آہو کی جست، شیر کی آمد، پری کی چال
کبک دری خجل، دل طاؤس پائمال
سبزہ سُبک روی میں قدم کے تلے نہال
اک دو قدم میں بھول گئی چوکڑی غزال

جو آگیا قدم کے تلے گرد بر د تھا
چل مل، غضب کی تھی کہ چلا وہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا
آیا عرق تو ابر گہربار بن گیا
گہ قطب، گاہ گنبد دوّار بن گیا
نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا

حیراں تھے اُسکے گشت پہ لوگ اس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرنا تھا کیا جھوم جھوم کے

تلوار — مرثیہ گویوں کا سب سے بڑا موضوع شاعری یہی ہے، اور مرزا دبیر صاحب تو اس عالم میں لامکان تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سب کچھ کہتے ہیں اور غور سے دیکھئے تو (تلوار کے متعلق) کچھ نہیں کہتے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مرزا دبیر ؎

مدّ نگہ چشم نیام اوج پر آیا — اور صاف ہر اک فرد بشر کو نظر آیا
خط کھینچنے کو کلک دواتِ ظفر آیا — ولہ — یا دور کے ظلمت کی گلے سے خضر آیا
ظلمات میں یہ فتح پہ قبضہ کئی پھری — ولہ — یونس کو جیسے بطن میں ماہی لئی پھری
مثل ہوا سروں میں سمائی چلی گئی — ولہ — بُو کی طرح دماغوں میں آئی چلی گئی
ذات اک طرف مٹا دیا اس نے صفات کو — ولہ — کیسی نہ بال، زباں سے کاٹ ائی بات کو
کاف شگاف بن کی درون جگر گئی — ولہ — مانند سیم مرگ، میانِ کمر گئی
لفظِ شکم میں دینے کو زیر و زبر گئی — ولہ — مانند پیش ہر جزو کل سے گذر گئی
تلواروں پردہ سیف جو شعلہ فشاں ہوئی — ولہ — جل بھن کر آب تیغ کی ران میں دھواں ہوئی
گیا جو فوق سے تحت الثری کو آب حسام — ولہ — بنا خزانہ قاروں خرابہ حمام
فلک نے تختہ یوناں کھا زمیں کا نام — ہوا رطوبت اطراف سے زمیں کو زکام

دماغ خاک پہ نزلہ بصد وفور گرا
کیا جو عطسہ تو قاروں نکل کے دور گرا

خود انصاف کرو، یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسم ہے،

میر انیس صاحب بھی اگرچہ سامعین کی بدمذاقی کے اثر سے کہیں کہیں براہ نکل جاتے ہیں، تاہم واقعیت اور اصلیت کا جوہر ہر جگہ نمایاں رہتا ہے، سب سے پہلے دیکھو تلوار کا سراپا کس طرح کھینچتے ہیں ؎

پٹہ وہ اُس کا اور وہ باریکی خمیر — کس بل میں بےمثال، اصالت میں بےنظیر
دلسوز شعلہ خو، شرر انداز و جانگداز — لشکر کش و شکست رسان و ظفر فراز
خونخوار کج ادا و دل آزار و سرفراز — حاضر جواب، تیز طبیعت زباں دراز

سچ اسکی ہے پسند جہاں کو سبھی نہ ہو
معشوق پھر نہیں کہ جو اتنی کجی نہ ہو

ذوالفقار سے تشبیہ، ؎

جوہر وہی، برش کا وہی طور خم وہی — تیزی وہی غضب کی وہی کھاٹ دم وہی
چلنا اسی طرح کا، چمک دمبدم وہی — رنگت زمردی وہی پانی میں سم وہی

تلوار کی کاٹ اور اس کی تعریف ؎

چمکی، گری، اُٹھی اِدھر آئی اُدھر گئی — خالی کیئے پڑے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم، کبھی بالائے سر گئی — ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی

غل تھا یہ کیا ہے، آج جو قہر صمد نہیں
ایسا تو رد و تیل میں جذر و مد نہیں

بجلی گری کہ فوج پہ تیغ دوسر گری — کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ، کبھی فرق پر گری — سٹک کر ادھر سے جو اُٹھی اُدھر گری

زرہیں تنوں میں مثل کفن چاک ہو گئیں

اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہوگئیں

اک شور تھا کہ تیغ ہے یہ یا خدا کا قہر
بہتی ہے جس کی آگ سی کوسوں لہو کی نہر
ناگن ہی یہ کہ کاٹے کی جس کی نہیں ہے لہر
اُتری گلے سی چڑھ گیا سارے بدن میں زہر

زخموں سی جسم، ڈر سے کلیجے فگار ہیں
جوہر نہیں ہیں تیغ میں دندان مار ہیں

یکتا برش میں جوہر ذاتی میں قدر میں
چمکی احد میں خیبر و خندق میں بدر میں
تیزی وہی تھی سان کی اس آشوب و غدر میں
بڑھ کر سپر سے سر میں گئی، سر سے صدر میں

کھچتی ہوئی سپر سے نیا رنگ ڈھنگ تھا
راکب تھا نہ فرس تھا نہ زیں تھا تگ تھا

غسل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی یہ گری
برچھی سی اڑ گئی وہ سناں، یہ گرہ گری
ترکش کٹا کمان کیانی سی زہ گری
یہ سر اڑا، وہ خود اڑا، یہ زرہ گری

آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برق قہر الٰہی اسی طرح

سر لوٹتے تھے برچھیوں والوں کی ہر طرف
ٹکڑے پڑے تھے دشت میں بھالوں کی ہر طرف
پامال تھے سوار و رسالوں کے ہر طرف
پر کالے اڑتے پھرتے تھے بھالوں کی ہر طرف

خاطر نشان تھی کسی آفت نشان کی
انبار تھیں کٹی ہوئی شاخیں کمان کی

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے
تنتی تھی بس تنوں سے زبن پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے
دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے

کیا جانئے ملا تھا مزہ کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخواں کو

ہر ہاتھ میں اُڑا کے کلائی نکل گئی
کوندی گری، زمیں میں سما کی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی
مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی

چار آئینہ کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سی گرتی تھی خاک پر
پہنچوں سے ہاتھ، شانوں سے بازو، تنوں سے سر
قبضہ سی تیغ، بر سے زرہ، ہاتھ سے سپر
برچھی سے پھل، کماں سے زرہ، زین سے تبر

ترکش کہیں پڑے تھے نشانِ زری کہیں
پیکاں کہیں تھی شست کہیں تھی سری کہیں

جب صف پہ وار کرتے تھے سلطان بحر و بر
اُڑتی تھی کٹ کے صورتِ کاغذ ہر اک سپر
چھپتی تھیں بھاگی جاتی تھیں گرتی تھی خاک پر
قبضوں سے تیغیں جسم سے رو جیں تنوں سے سر

پے تھے قدم، گریز کے کوچے بھی بند تھے
شعلہ وہ تیغ تھی، سپر اعدا سپند تھے

چھپتے تھے یوں وہ دیکھ کے اس تیغ کی چمک
بھاگے شعاعِ مہر سے جس طرح شپرک
اوجِ سما سے زلزلہ بر پا تھا تا سمک
چمکی وہ جب تو کانپ گئی چرخِ پر ملک

ہر شے تھی خوف جان سے خضوع و خشوع میں
سجدے میں تھی زمین تو فلک تھا رکوع میں

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آ کے اوج سے
پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے

چمکی جو برق سی تو نکل آئی تمگ سے
رکتی تھی نہ سپر سے نہ آہن نہ سنگ سے

خالق نے مُنہ دیا تھا عجب آب و تاب کا
خود اُسکے سامنے تھا پھپھولا حباب کا

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب
آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کی شکم پر کہ اسکی تاب
تیزی زباں پہ وہ کہ فرشتو نکو دے جواب

جوہر سے اُس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی بھی خون کی فوج کی اور آبدار بھی
غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی ابر تر بھی خزاں بھی بہار بھی
تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی

پانی نے اُس کے آگ لگادی زمانے میں
اک آفتِ جہاں تھی لگانے بجھانے میں

بیزوں کے بند بند قلم برچھیاں دو نیم
مثل قلم زبان دراز و سناں دو نیم
چار آئینہ کٹے ہوئے گز رگراں دو نیم
مغفر سے تا کمر جدِ پہلواں دو نیم

عالم تھا پیش آئینہ تیغ جو نہ تھا
لشکر میں کو تسا تھا وہ یکتا جو دو نہ تھا

وہ تیغ جب بڑھی صفِ کفار ہٹ گئی
چمکی جو برق ڈھالوں کی ہلی سمٹ گئی
دم بھر میں یوں صفوں کو اُلٹ کر لپٹ گئی
رَن کی زمیں لہو کے ڈبرڑوں سے کٹ گئی

دریا بھی آب تیغ سے بے آبرو ہوا
غل تھا کہ لو فرات کا پانی لہو ہوا

اس موقع پر شاید تمہارے ذہن میں یہ خیال آئے کہ میر انیس کی رزمیہ میں گو الفاظ کی شکوہ و شان کی کچھ انتہا نہیں لیکن اصلیت اور واقعیت سے یہ مراحل دور ہیں کربلا کا واقعہ نتائج کے لحاظ سے بے شبہ ایک اہم واقعہ ہے لیکن معرکہ آرائی کے لحاظ سے اسکی صرف یہ حیثیت ہے کہ ایک طرف سو سوا سو آدمی تشنہ لب اور بے سروسامان تھے دوسری طرف چار ہزار کا مجمع تھا جو دفعتہً ٹوٹ پڑا اور تین گھنٹے میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا، ایسے واقع کے متعلق یہ کہنا کہ زمین تھرا گئی آسمان کانپنے لگے پہاڑ جگہ سے ہٹ گئے، دریا اُبل پڑے، فرشتے آسمانوں میں چھپتے پھرتے تھے، وغیرہ وغیرہ، واقعیت سے کسقدر دور ہے،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں اصلیت اور واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا، بلکہ صرف دیکھا جاتا ہے کہ شاعر کو ان واقعات کا یقین ہے یا نہیں اگر وہ ان باتوں پر یقین رکھتا ہے، اُن کے اثر سے لبریز ہے اور جسقدر اُسکے دل پر اثر ہے اُسی جوش کیساتھ اُنکا اظہار بھی کرتا ہے تو اُسکی شاعری بالکل اصلی ہے، فرض کرو کہ شاہنامہ کے تمام واقعات غلط ثابت ہو جائیں تو اس سے فردوسی کی کمال شاعری میں فرق آئیگا،

شاعر کو قطعی یقین ہے کہ امام حسین علیہ السلام، تمام عالم کی کاروبار کے مالک ہیں، جن و انس، شجر و حجر، سب اُنکے محکوم ہیں، اُنکا غیظ میں آنا، کردگار عالم کا غیظ میں آنا ہے، اس صورت میں اگر اُنکی حملہ آوری سے زمین و آسمان دہل جائیں اور دنیا متزلزل ہو جائے تو استعجاب کی کیا بات ہے، یہ ضرور ہے کہ اس حالت میں بھی وہی واقعات بیان کرنے چاہئیں جن سے طبیعت پر واقعی اثر ہو صرف موہوم خیال بندی اور

تفاضلی نہ ہو، جیسا مرزا دبیر صاحب کا انداز ہے۔

یہ بات بھی بظاہر کھٹکتی ہے کہ رزم کے بیان میں عشقیہ الفاظ استعمال کرنا، بلاغت کے خلاف ہے اور میر انیس اکثر تلوار کی تعریف میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں مثلاً ؎

کس تکلف سے ولیلائے ظفر راہ چلی	گہ بڑھی گاہ رکی گاہ تھمی گاہ چلی
کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ رو جدا	جیسے کنار شوق سے ہو خوبرو جدا
سچ اسکی ہے پسند جہاں گو سبھی نہ ہو	معشوق پھر نہیں کہ جو اتنا بھی نہ ہو

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض کی بات نہیں، بلکہ میر انیس کے محاسن شاعری میں داخل ہے، علامہ ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں جہاں متنبی کے محاسن گنائے ہیں وہاں لکھتے ہیں، ؎

منها استعمال الفاظ الغزل والنسیب فی اوصاف الحرب وهو ایضاً مما لم یسبق الیه وتفرد به وظهر فیه الحذق	متنبی کے محاسن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ لڑائی کے بیان میں غزل کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور یہ بھی اسکی ان خصوصیتوں میں ہے جنکی پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی، جن میں وہ متفرد ہے،

اسکے بعد متنبی کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے، ؎

قد صبغت حدها الدماء کما یصبغ خد الحریدة الخجل	زین کے چہرہ کو خون نے اس طرح رنگین کر دیا ہے جس طرح شرم کی حالت میں معشوق کے چہرہ پر سرخی آجاتی ہے،

لیکن یہ بہت نازک موقع ہے رزم میں عشقیہ الفاظ اور تشبیہات کا استعمال وہیں تک جائز ہے جہاں تک کلام کا اثر نہ جانے پائے، اور کلام میں ابتذال نہ آجائے مرزا دبیر صلعب نے بھی میر انیس کی تقلید کرنی چاہیئے لیکن کلام کا یہ رنگ ہو گیا ؎

تلوار کی تعریف ؎

جب جھوں میں بھری فوج کی انبوہ سے نکلی | غل یہ تھا کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی

سلام

اردو شاعری کی اصل بنیاد غزل کی زمین پر قائم ہوئی، اور اقسام سخن میں سے اسی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا، عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا، لیکن غزل کی لے اسقدر کانوں میں پچ چکی تھی کہ اُن لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا اس بنا پر اُنہوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا، سلام کی بحریں وہی غزل کی ہوتی ہیں غزل کی طرح، مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ اور نئی بندش سادہ اور صاف، مضمون درد انگیز اور پُر تاثیر ہو، میر انیس کے سلاموں میں تمام باتیں پائی جاتی ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو ؎

صبر کرتے تھے سلامی! شہ والا کیا کیا | اہل کیں دیتے تھے مظلوم کو ایذا کیا کیا
شاہ فرماتے تھے پانی نہیں ملتا لیکن | سامنے آنکھوں کے لہراتا ہے دریا کیا کیا
سر شبیر سے کہتے تھے یہ رو رو سجاد | رنج دیتے ہیں مجھے راہ میں اعدا کیا کیا
طوق و زنجیر سنبھالوں کہ مہار اونٹوں کی | ق | کام اتنے ہیں کروں میں تن تنہا کیا کیا
رو رو کہتی تھی یہ صغرا کہ کہے جا قاصد | تو نے کیا کیا کہا اور شاہ نے پوچھا کیا کیا
دیکھ کر فوج حسینی کو عدو کہتے تھے | ساتھ لائے ہیں جو اں سید والا کیا کیا
خط لئے لاشۂ اکبر پہ یہ کہتے تھے امام | دیکھو بیٹا! تمہیں صغرا نے ہے لکھا کیا کیا

ایضاً

کچھ اور حرز زباں نہیں اہل سخن کے پاس
مجرائی کیا زبان کے سوا ہی دہن کے پاس

سمجھے یہ سب کہ عونؑ و محمدؑ ہوئے شہید
روتے ہوئے حسینؑ جو آئے بہن کے پاس

چلائی بانو دیکھ کے اصغرؑ کو قبر میں
مجھ کو بھی گاڑ دے کوئی اس گلبدن کے پاس

صدمے سے کانپنے لگے عابد کے ہاتھ پاؤں
جس وقت بیڑیاں نظر آئیں رسن کے پاس

ایضاً

سلامی! آنکھ سے رہ رہ کے خوں ٹپکتا ہے
غم سجادؑ بیکس دل میں کانٹا سا کھٹکتا ہے

دم تحریر گلریزی ہے یا سطریں ہیں کاغذ پر
صریر کلک ہے یا باغ میں بلبل چہکتا ہے

پھرے تھے کربلا کی راہ سے کچھ سوچکر حضرتؑ
وگرنہ رہبر عالم کہیں رستہ بہکتا ہے

حرم روئے کہا جب آسماں کو دیکھکر شہ نے
علی اکبرؑ اذاں دو صبح کا تارا چمکتا ہے

زمین کربلا پر فاطمہؑ کے پھول بکھرے ہیں
شہیدوں کی یہ خوشبو ہے کہ جب جنگل مہکتا ہے

تن رنجور پر ہاتھ اپنا زینبؑ رکھ نہیں سکتی
تپ غم سے بدن سجادؑ کا ایسا دہکتا ہے

کہا بانو نے شہ سے تیر چلتے ہیں کلیجہ پر
مرا منہ جب یہ بچہ برگسی آنکھوں سے تکتا ہے

یہ ننھے ننھے دونوں ہاتھ بل کھاتی ہیں سینہ پر
مسوڑے ہو گئے ہیں نیلگوں تا لو ٹپکتا ہے

ایضاً

مجرائی جب کہ عیان ماہ عزا ہوتا ہے
چرخ پر ماتم شاہ شہدا ہوتا ہے

پھیریں آنکھیں جو اصغرؑ نے پکاری بانو
دوڑو اے بی بیو! دیکھو تو یہ کیا ہوتا ہے

دیر بیٹوں کو لگی رن میں تو زینبؑ نے کہا
لاشیں آتی ہیں اگر فضل خدا ہوتا ہے

کہتی تھی خلق خدا دیکھ کے عابدؑ کو اسیر
کہیں بیمار بھی رسی سے بندھا ہوتا ہے

ایضاً

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو

یہ جھجریاں نہیں ہاتھوں میں ضعف پیری کے
چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

بھلا نزد دبیجا سے اس میں کیا حاصل
اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

رباعیات

صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے اظہار کیلئے سب سے زیادہ موزوں چیز رباعی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن شعرا مثلاً خیام، سنائی، سلطان ابوسعید ابوالخیر نے ان مضامین کو اپنا موضوع شاعری قرار دیا تھا، انہوں نے رباعی کے سوا تمام عمر میں اور کچھ نہ لکھا۔

اردو شاعری میں چونکہ یہ مضامین بہت کم ادا کئے گئے اس لئے رباعیاں بہت کم پائی جاتی ہیں، سودا نے البتہ نہایت کثرت سے رباعیاں لکھیں اکثر عشقیہ، یا خیال آفرینی کی غرض سے لکھی ہیں،

میر انیس کی رباعیوں کا ایک بڑا دفتر ہے اور ہر رباعی میں کوئی نہ کوئی اخلاقی مضمون ادا کیا گیا ہے بعض ایسی بھی ہیں جن میں صرف مضمون بندی، یا کوئی صنعت ہے۔ چنانچہ ہر قسم کے نمونے ذیل میں درج ہیں ؎

۱
اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے
بے زاد سفر کوچ کی تیاری ہے

۲
مرمر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک
یہ قبر کی منزل بھی بہت بھاری ہے

ہموار ہے، اگر تو تجھ کو کچھ باک نہیں	۱۳	سرکش ہے اگر، تو عقل و ادراک نہیں
پاتا نہیں تُند خو کدورت کے سوا		دامن میں ہوا کے کچھ بجز خاک نہیں
راہی طرفِ عالمِ بالا ہوں میں	۱۴	دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں
یارب تیرا نام پاک جپنے کے لئے		گویا اک ہڈیوں کا مالا ہوں میں
مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے	۱۵	رُخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر		میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے
کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے	۱۶	کب ٹھہرتے ہیں اشک جو ہیں ڈھلنے والے
اللہ رے سخن کی تیری تاثیر انیس		رو دیتے ہیں مثلِ شمع، جلنے والے
ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا ہے	۱۷	ہنگام یخ و برف و تگرگ آیا ہے
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا		چلئے اب چوبدار مرگ آیا ہے
نافہم سے کب داد سخن لیتا ہوں	۱۸	دشمن ہو کہ دوست سب کی سُن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بلبلوں کی دوستاں بیرنگ		کانٹوں کو ہٹا کے پھول چُن لیتا ہوں
رتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے	۱۹	وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی		جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے
کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے	۲۰	جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگدل ہوتے ہیں		دندان صف بستہ ہیں زباں کے آگے
جس شخص کو عقبیٰ کی طلبگاری ہے	۲۱	دنیا سے ہمیشہ اُسے بیزاری ہے
اک آنکھ ہیں کس طرح سمائیں دونوں		غافل! یہ خواب ہے، وہ بیداری ہے
کس دن فریبِ خامہ نگ و دو میں نہیں	اویگر	مجھ سا بھی سیہ بخت کوئی سو میں نہیں

ہر چند کہ ہوں خسروِ اقلیمِ سخن	پر غیر دوات کچھ قلمرو میں نہیں
جس جا ذکرِ حسین ہو جاتا ہے	رونے سے دلوں کو چین ہو جاتا ہے
آکر بزمِ عزائے شہ میں روتا	ہر شخص پہ فرض عین ہو جاتا ہے
جو روضہ میں بار یاب ہو جاتا ہے	ہر کام میں کامیاب ہو جاتا ہے
جلتا ہے جو شب کو قبرِ حیدر پہ چراغ	وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے

اعتراضات

میر انیس کے کمال کا اگرچہ جس قدر مجھ کو اعتراف ہے شاید ہی کسی اور کو ہوگا تاہم میرا یہ دعویٰ نہیں کہ اُنکا کلام فروگذاشتوں اور غلطیوں سے پاک ہے، ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، اُن میں باوجود دعویٰ آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا، اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رُخ اس کو دکھائے جائیں، لیکن عذر کرنیوالے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں جس چیز نے اُن کو اظہارِ حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ اور عذر کرنیوالوں کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ، ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں ان میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی، اسلئے وہ اچھی باتوں کیساتھ، اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں، اور سلسلہ در سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔

بہرحال ہماری رائے ہے کہ جس وسعت اور تفصیل کیساتھ میر انیس کی

غوبیاں ظاہر کیگئی ہیں، اسی طرح نہایت آزادی اور بیباکی کے ساتھ اُن کی ہر قسم کی فروگذاشتیں اور غلطیاں بھی ظاہر کی جائیں،

ایک زمانہ ہوا عبد الغفور خاں نساخ نے میر انیس کی بہت سی غلطیاں ایک رسالہ میں ظاہر کی تھیں، چنانچہ شروع کتاب میں اسکا ذکر ہو چکا ہے، پہلے ہم ان اعتراضات کو اجمالاً مع جواب کے نقل کرتے ہیں۔

۱۔ میر صاحب نے جا بیجا۔ سینہ۔ مدینہ۔ کینہ۔ قرینہ۔ کو دانا اور ربینا کا قافیہ باندھا ہے، مثلاً ؎

حق نما ہے تو جہاں میں یہی آئینہ	اُس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں مینا

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ قدماء کا طریقہ تھا اور میر انیس کا ابتدائی کلام قدماء کے استعمال کے موافق ہے۔ اس جواب پر اسقدر اور اضافہ کرنا چاہیئے کہ گو متاخرین نے اس کو ترک کر دیا۔ لیکن کلام کی وسعت کیلئے یہ سختیاں اُٹھا دینی چاہئیں شاعری وصل اور ہجر کے سوا اور بھی کام لیتے ہیں اور وہ بغیر اسکے نہیں ہو سکتا کہ قافیہ میں وسعت پیدا کیجائے ورنہ شاید یورپ کی طرح ہمیں سے قافیہ سے دست بردار ہونا پڑے گا،

۲۔ جن الفاظ میں نون کا اعلان ضرور ہے میر صاحب اکثر جگہ اعلان نہیں کرتے مثلاً ؎

عباس سے یہ کہنے لگے شاہِ دو جہاں	تم جا کے اُس عمو کو بلا لاؤ بھائی جاں

اس اعتراض کا بھی یہی جواب ہے،

۳۔ جہاں نون کا اعلان جائز نہیں، وہاں اعلان کرتے ہیں، مثلاً ؎

لپٹوں گلے سے پدرِ نا توان کے	سینے سے تو سرک تو مرے بابا جان کے

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ شعر میر صاحب کا ہے ہی نہیں، الحاقی ہے، لیکن

میر صاحب کے ہاں کثرت سے اسکی مثالیں پائی جاتی ہیں، اسلئے یا تو میر صاحب کی غلطی تسلیم کرنی چاہیئے یا یہ کہنا چاہیئے کہ یہ بھی میر صاحب کی توسیعات شعری میں داخل ہے،

گویا کہ تھا شبیہ الم سر بسر نشاں (۴) ڈوبا تھا خون میں پنجۂ پر نور او رنشاں

اس شعر میں سر بسر قافیہ اور ہے اور یہ بالکل غلط ہے، اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مصرع ثانی اصل میں یوں ہے "ڈوبا تھا خوں میں پنجۂ پر نور زر فشاں"

۵- اکثر جگہ شایگان قافیے ہیں، چنانچہ نساخ نے بہت سے اس قسم کے شعر نقل کئے ہیں مجیب نے ان تمام شعروں سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ یوں نہیں بلکہ یوں ہیں، مثلاً اس بند میں ؎

ناگاہ بڑھی فوج، ہوا جنگ کا ساماں	اور گھٹنے لگی طاقتِ جسم شہِ مرداں
شہزادے پہ جب پڑنے لگا تیر کا باراں	تلوار علم کر کے کہا یا شاہِ مرداں

شہ مرداں مکرر آیا ہے، مجیب صاحب کہتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں شہ مرداں کے بجائے شہ ذیشاں تھا غلط نویسوں نے ذیشاں کا شہِ مرداں بنا دیا ہے، لیکن اس قسم کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہے اور اگر اسکو وسعت دیجائے تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو نہایت آسانی سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یوں نہیں یوں تھا، اس شعر میں دوسرے سے اعتراض ہی غلط ہے کیونکہ شہِ مرداں سے ایک جگہ امام حسینؑ اور دوسری جگہ حضرت علیؑ مراد ہیں، اسلئے قافیہ مکرر نہیں، لیکن جہاں واقعی قافیہ شایگان ہے وہاں بھی تاویل کی ضرورت نہیں، جو اساتذہ کثیر الکلام ہیں اور جن کو سینکڑوں قسم کے مضامین ادا کرنے پڑتے ہیں وہ اس قسم کی قیدوں کی پابندی نہیں کرتے۔

۶- اکثر جگہ حروف تقطیع میں گر جاتے ہیں۔ مثلاً

ع رانڈ ہوتی ہے اک رات کی بیاہی ہوئی دختر،
ع یہ کہہ کے بس عورات نے عریاں کئے سر،
ع باہیں جو گلے میں نہیں تو بند دیدۂ خونبار،

ان اعتراضات کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ سب کاتب کی غلطی ہے، پہلا مصرع یوں ہے
بیوہ ہوئی اک رات کی بیاہی ہوئی دختر، اسی طرح اور مصرعوں کو بدلا ہے،
حرفوں کا تقطیع میں گرانا، اگر واقعی ناگوار معلوم ہوتا ہے لیکن اساتذہ کے ہاں
کثرت سے اسکی مثالیں پائی جاتی ہیں ؎

	مرا پند خردمنداں بحال خود نمے آرد		بایں افسانہا مجنون عشق عاقل نمیگردد
عاقل	تا توانی سختہ بند یک متقام عاقل مباش		
علی	ای رگ جان بہا ایں ہمہ بیرحمی چیست		خاک از مقدم تو خون شدن عادت دارد
غنی	تن گل، عارض گل، بدن گل، چہرہ گل، رخسار گل،		
	بدہ ساقی آں آب یاقوت را		کہ سازم علاج عقل فرتوت را

ان کے سوا اور بہت سی مثالیں ہیں، جنکو تطویل کے لحاظ سے قلم انداز کیا گیا

۷۔ ناگاہ بجا فوج عدو میں طبل جنگ،
ہو مغفرت خلیق کی یارب ذوالکرام،

طبل متحرک الاوسط صحیح نہیں، اور ذوالکرام مہمل لفظ ہے مجیب صاحب کہتے ہیں
کہ اصل میں طبل کے بجائے دہل، اور ذوالکرام کے بجائے یا خالق الانام ہے،

۸۔ تھا زیر زرہ گاؤ سر اس طرح کا بکتر،

اعتراض۔ بکتر گاؤ سر نہیں ہوتا۔

جواب اصل میں یوں تھا ع پہنے ہوئے زیر زرہ اس طرح کا بکتر،

۹۔ اُنزا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا عالی، "کونین کا عالی" غلط ہے۔

جواب۔ اصل میں عالی کی بجائے والی ہے،

۱۰۔ رنگ رُخ کفار عرب ہو گیا فق سے رنگ فق سے ہو گیا۔ محاورہ نہیں

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ میر انیس جو کچھ کہہ دیں وہی محاورہ ہے،

۱۱۔ شرمندہ زمانہ سے گئے وایل و سجبان، وایل کوئی فصیح نہیں گذرا۔

جواب۔ اصل یہ ہے۔ وعیل و سجبان۔

ان اعتراضات کے علاوہ، نساخ نے اور بھی بہت سے اعتراض کئے ہیں لیکن چونکہ وہ صحیح نہ تھے، قلم انداز کئے گئے۔ نساخ نے بہت سے صحیح اعتراضات چھوڑ بھی دیئے اُنکی تفصیل ذیل میں ہے،

بُت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے	صاف کر دیا چاہیئے
برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی	پروانگی غلط ہے۔
جو حرف قرآن کا ہے وہ ہی لائق تعظیم	قرآن بروزن فعلان ہے،
ایسا بھی کوئی بیکس و بے آس نہ ہوگا	بے آس کا عطف بیکس پر جائز نہیں۔
گرتے تھے طیوران ہو کھولے ہوئے پر	طیور خود جمع ہے، اسکی جمع الجمع، نہ صحیح ہے نہ مستعمل
جو خوبیاں کہ چاہئیں وہ سب حصول میں	حصول کے بجائے حاصل چاہیئے۔
کمتی نہیں پانی کی سلطنت میں عنبلیں	کمتی انفار اور ارافل کی زبان ہے،
واللہ اس سے زور بیاں لاانعد ہوا	قتل اس کے ہاتھ سے عمر عبدوہ ہوا

عبدوہ لاانعد کا قافیہ نہیں ہو سکتا،

کرار ہے وہ شخص نہ غیر فرار ہے	فرار بہ تشدید را چاہیے،
عالم کی تغیری پہ بحالی کی ہے آمد	تغیری صحیح نہیں۔
مت روکنا ہی خاطر مہماں واجبات	واجبات سے یا واجب چاہیئے۔
اس مژدہ کو سنتے ہی خوشی ہو گئی شیریں	خوش چاہیئے،

اس قسم کی اور بہت سی غلطیاں ہیں، اور غلط نویسی کا عذر ہر جگہ کام نہیں آسکتا حقیقت یہ ہے کہ میر انیس کے کلام میں اس قسم کی غلطیاں ضرور موجود ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جسقدر قادر الکلام اور پُر گو شعر اگذرے ہیں سب کی یہی حالت ہے فردوسی سے بڑھکر کون قادر الکلام ہوگا، متاخرین میں قاآنی کا جواب نہیں، ان دونوں کے کلام میں اس قسم کی بے اعتدالیاں نہایت کثرت سے موجود ہیں۔ لوگ ان شعرا کو نمونہ بناتے ہیں جن کی شاعری کا دائرہ چند عشقیہ خیالات تک محدود ہے۔ لیکن جو شخص سینکڑوں قسم کے مختلف واقعات کو شعر میں ادا کرنا چاہتا ہے وہ ان مسامحات سے کیونکر بچ سکتا ہے اسلئے قادر الکلام شعرا کو اس جرم سے بری رکھنا چاہیئے۔

لفظی غلطیوں کے سوا معنوی حیثیت سے بھی بہت سی باتیں قابل اعتراض ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اکثر جگہ مصرعوں میں باہم ربط نہیں ہوتا، اور صاف نظر آتا ہے کہ دوسرا مصرع برجستہ نکل آیا تھا، اسلئے زبردستی قافیہ اور ردیف کی رعایت سے اوپر کا مصرعہ پیوند کیا ہے مثلاً ۵

سر پر کہیں ہوئے ہیں سخی دے نی کہیں	بوڑی کہیں تھی ڈنڈ کہیں تھی انی کہیں
سمجھو نہ دور آنکھ ملانے کی دیر ہے	پتلی ہے چشم میں کہ ترائی میں شیر ہے

آنکھ کی تعریف

تلوار کی تعریف

بیشل تھی شرف میں اصالت میں نیک تھی
ملجا تھیں دو زبانیں جو اُس کی تو ایک تھی

خواہاں تھے زیب گلشن نسرا جوا کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

ہلتے تھے دو ملے ہوئے گھوڑوں کی گشت سے
خاک آسماں پہ جاتی تھی اڑ اڑ کے دشت سے

بد ہاتھ میں شکست، ظفر نیک ہاتھ میں
ہاتھ اڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں

اس قسم کے اور سینکڑوں اشعار ہیں۔

۲- اکثر جگہ لفظی رعایت کی پابندی کی وجہ سے کلام، اوچھا اور بے اثر ہو جاتا ہے، مثلاً حضرت امام حسین علیہ السلام کا تمہیدی فقرہ سن کر تمام لشکر میں جب سناٹا چھا گیا ہے تو اس موقع پر لکھتے ہیں ؎

یہ صدا سنتے ہی خود رک گیا قرنا کا خروش
تھم گیا طبل و غا کی بھی وہ آواز کا جوش

ہو گیا جو ڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش
کیا بجاتے کہ بجانے نہ کسی شخص کی ہوش

چھیڑتا اُن کو سرودوں کا بھی ناساز ہوا
رعب فرزند نبی سُرمۂ آواز ہوا

پہلے تین مصرعوں میں رعب اور ہیبت کا جو اثر پیدا ہوا، "بجانا" "سرود" "ناساز" کی ضلع جگت نے اس کو بالکل زائل کر دیا،

یا مثلاً اس دعا میں ؎

اس باغ میں جو چشمے ہیں تیرے فیض کے جاری
بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گذاری

ہر نخل برومند ہے یا حضرت باری
پھل ہم کو بھی ملجائے ریاضت کا ہماری

نخل برومند باری، پھل ریاضت، کا التزام یہ اثر پیدا کرتا ہے کہ دعا مانگنے والے کا دل، خضوع و خشوع سے زیادہ، لفظی رعایتوں میں لگا ہوا ہے،

یا مثلاً ان اشعار میں نہایت متبذل طریقہ سے لفظی رعایت کو صرف کیا ہے،

ع بولے نہنگ، خوب نہیں یہ اگر مگر،

ع سایہ کنوئیں میں اُترا تھا پانی کی چاہ سے،

ع اب ہاتھ دستیاب نہ تھے منہ چھپانے کو،

ع آری جو ہو گئیں تھیں، وہ سب ذوالفقار سے،

کونسا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

شجرِ قامت سرور پہ چوڑے گا نظر
سرچڑھیگا ترا برچھی پہ یہ ہی اسکا اثر

الفتِ زلف سے بھی بیچ میں پڑ جائے گا
خالِ رُخ دیکھا تو تو خال سے لگ جائیگا

بدر پیشانی سرور کا جو ہے سر میں خیال
تو اسی ماہ میں نقصان ترا ہوئیگا کمال

سب میں ہو جائیگا انگشت نما مثلِ ہلال
تیر و شمشیر ہے ابرو کی محبت کا وبال

عشق رُخسار میں رُتبہ ترا گھٹ جائیگا
مُنہ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ترا کٹ جائیگا

پاؤں یہ وہ ہیں کہ ان پاؤں کو جو ہاتھ لگائے
تو سر دست سرافرازی کونین کو پائے

اس قسم کی تکلف کی ہزاروں مثالیں ہیں،

ان تکلفات کی وجہ سے اکثر جگہ بلاغت کا سررشتہ بالکل ہاتھ سے جاتا رہتا ہے مثلاً صغرا کو جب حضرت امام حسین علیہ السلام، سفر میں ساتھ نہیں لیجانا چاہتے اور ان کی بیماری کا عذر کرتے ہیں تو وہ کہتی ہیں، کہ کیا گھر پر تنہا رہنے اور رونے پیٹنے سے میں اچھی ہو جاؤنگی اس موقع پر لکھتے ہیں۔

ع غم کھانے سے آجائیگی قوت مرے تن میں، ؟

ان تمام اعتراضات کا صرف یہ جواب ہے کہ لفظی رعایت کی پابندی کے سوا جو لکھنؤ کی خمیر بنگیا تھا، باقی عیوب، الزمۃ الشافی ہیں، اور کسی بشر کا کلام اُن سے پاک نہیں ہو سکتا،

سرقات

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ میر انیس (اور دبیر) کے بہت سے اشعار پر سرقہ کا گمان ہو سکتا ہے کیونکہ وہی مضامین بعینہٖ، یا بہ تخفیف تغیر قدیم اساتذہ کے ہاں پائے جاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سب پر سرقہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا اساتذہ کا قاعدہ ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک مضمون کسی متقدم شاعر نے باندھا لیکن اچھی طرح نہ بندھ سکا یا اس پر ترقی ممکن ہے تو وہ دانستہ اسی مضمون کو لیکر اس طرح ادا کرتے ہیں کہ جو کسر تھی نکل جاتی ہے، اور شعر بلند رتبہ ہو جاتا ہے، فردوسی نے خیمہ کی تعریف لکھی تھی ؎

یکے خیمہ داشت افراسیاب	زمشرق بہ مغرب کشید طناب

نظامی نے دیکھا کہ مبالغہ اچھا ہے لیکن کوئی ثبوت نہیں انہوں نے ایک تشبیہ پیدا کر کے ثبوت دیدیا ؎

یکے خیمہ داشت چوں آفتاب	زمشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

آفتاب کی تشبیہ نے مشرق سے مغرب تک طنابوں کو کھینچا ہونا ثابت کر دیا کیونکہ آفتاب خیمہ سے اور اُسکی کرنیں طناب سے مشابہ ہیں،

سعدی کا شعر تھا ؎

ترا ہر آئینہ باید بہ شہر دیگر رفت	کہ دل نماند دریں شہر تا ربائی باز

شہر کے شہر کا دل چین لینا معشوق کا کمال ہے۔ لیکن معشوق کو یہ صلاح دینی کہ وہ کسی اور شہر کو چلا جائے تعوبات ہی اسلئے امیر خسرو نے اس کا چارہ کار یہ بتلایا ؎

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی	مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

سلمان ساوجی کا شعر تھا ؎

شاہد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل	شاہد آن است کہ ایں دارد و آنے دارد

خواجہ حافظ نے اسکو مطلع کر کے بلند کر دیا ؎

شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد	بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

سلمان کے شعر میں وآں کا جو لطف تھا، وہ اچھی طرح ادا نہ ہو سکا تھا کیونکہ آن میں نون بہ اعلان ہے اسلئے آن (جو ایں کا مقابل ہے) کا ایہام نہیں ہوتا۔ خواجہ حافظ نے اس نقص کو یوں پورا کیا ؎

ایں کہ مے گویند آں بہتر ز حسن	یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

صاف نظر آتا ہے کہ ان لوگوں نے دیکھا کہ ایک عمدہ بات پیدا ہوئی تھی لیکن ناقص رہ گئی ایک چیز کو ناقص چھوڑ دینا اچھا نہ تھا، اسکو پورا کر دیا، اگر اس کا ندم سرقہ ہے اور یہ محبوب ہی تو دنیا میں ہر قسم کی صنعتیں جو ایجاد ہوئیں وہ اسی پہلی حالت پر قائم رہنی چاہئے تھیں چھکڑے کی بجائے فٹن اور بروم تیار کرنا بھی سرقہ قرار پاتا، میر صاحب کے ہاں جو سرقے پائے جاتے ہیں اکثر اسی قسم کے ہیں۔

مثلاً حضرت امام حسین علیہ السلام نے جب یزید کی فوج کے سامنے اتمام حجت کے طور پر جناب رسالت پناہی سے اپنا تعلق ثابت کیا ہی تو یہ بھی بیان کیا ہی کہ اس وقت میرے بدن پر جو اسلحہ اور ملبوسات ہیں وہ آنحضرتؐ کے ملبوسات ہیں۔ اس

مضمون کو میر ضمیر نے اس طرح ادا کیا تھا ؎

پہچانتے ہو کس کی سر پر ہے دستار — دیکھو تو عبا کسکی ہے کاندھے پہ نمودار
یہ کس کی زرہ کسکی سپر کسکی ہے تلوار — میں جس پہ سوار آیا ہوں کس کا ہے یہ رہوار
باندھا ہے کمر میں جسے یہ کسکی ردا ہے
کیا فاطمہؑ زہرا نے نہیں اسکو سیا ہے

یہ واقعہ مرثیہ کا ایک ضروری جزو تھا، اسلئے میر انیس صاحب اسکو بالکل چھوڑ نہیں سکتے تھے لیکن دیکھو، اسی بات کو کیونکر ادا کیا ؎

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کسکی دستار — یہ زرہ کسکی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ کو سپر
برمیں کس کا ہے یہ چار آئینہ جوہر دار — کس کا رہوار یہ ہے آج میں جس پر ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے یہ تیغ دوسر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کسکی ہے

میر ضمیر — جبتک کہ ذوالفقار نہ کاٹے یہ تین سر — ہرگز نہ دم لیا پر روح الامین پر
میر انیس — خیبر میں کیا گذر گئی روح الامین پر — کاٹے ہیں کسکی تیغ دو پیکر نے تین پر
میر ضمیر — اس نیزہ پیاسی تھا سبب کیم جان — تھا اژدہائے سولی عمران کی وہ زبان
میر انیس — گویا زباں نکالے ہوئے اژدھا چلا
میر ضمیر — اک نیزہ ہوا پار وہ سو سو کی جگر سے — رشتہ کا گذر ہوتا ہے جوں سلک گہر سے
میر انیس — ہوتا تھا پار آکے وہ ہنگام دار و گیر — سوں ہی مثل رشتہ تسبیح ایک تیر
میر ضمیر — کوبن میں پکار ہوئی الامان کی — انسان تم کیا جنو کو پڑی اپنی جان کی
میر انیس — ع چلاتی تھیں پریاں کہ خدا جان بچائے

لیکن بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جن میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہے بلکہ کسی فارسی شعر کو بعینہٖ لے لیا ہے، اس قسم کے مضامین کو حُسنِ ظن ہو تو توارد، ورنہ سرقہ کہنا چاہیئے۔ چند مثالیں نمونہ کے طور پر ذیل میں لکھی جاتی ہیں ؎

میر انیس	ہیہات کبھی قافلہ سے رہنا نہیں انیس	اے عمر دراز تیری کوتاہی ہے	
لاحد		کوتاہیئے کہ بود زعمر دراز بود	
میر انیس	عقدے سب حل ہوئے مگر عقدۂ اجل	یہ بندِ اجل کسی سے کھولا نہ گیا	
بوعلی سینا	کردم ہمہ مشکلات عالم را حل	ہر بند کشودہ شد مگر بند اجل	
میر انیس	نافہ کی طرح عمر خطا میں گذری	بالوں پہ سفیدی ہے سیاہی دل میں	
کاتبی	بودیم ہمچو نافہ ہمہ عمر در خطا	موئے سفید بین، و درون سیاہ ما	
میر انیس	ہر سمت تھی سناں پہ سناں مثل خاردار	ہر صف میں تھی سپر پہ سپر مثل لالہ زار	
نظامی	سناں بر سناں سنہ چوں نوک خار	سپر بر سپر بستہ چوں لالہ زار	
میر انیس	خود پیام زندگی لائی قضا میرے لئے	شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے	
لاحد	چوں نفی نفی اثبات است از نفی مترس	بقائے من چو شمع کشتہ باشد در فنائے من	

میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ

اردو علم ادب کی جو تاریخ لکھی جائیگی، اس کا سب سے عجیب تر واقعہ یہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو ملک نے میر انیس کا مقابل بنایا، اور اس کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ ان دونوں حریفوں میں ترجیح کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے،

شاعری کس چیز کا نام ہے؟ کسی چیز کا، کسی واقعہ، کسی حالت کا، کسی کیفیت کا،

اس طرح بیان کیا جائے کہ اُسکی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے،
دریا کی روانی، جنگل کی ویرانی، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، پھولوں کی مہک
خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی سختی، گرمی کی طپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح
کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، بارنج وغم، غیظ وغضب، جوش ومحبت، افسوس و
حسرت، عیش وطرب، استعجاب وحیرت، ان چیزوں کا اس طرح بیان کرنا کہ وہی کیفیت
دلوں پر چھا جائے، اسی کا نام شاعری ہے،

اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی
کے ساتھ بے تکلفی و آرایش اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت
کے مراعات ان تمام اوصاف میں سے کونسی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے فصاحت،
ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات اور
استعارات، اکثر دور از کار۔ بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت
کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں، خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے
لیکن اکثر جگہ، اس کو سنبھال نہیں سکتے۔

ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ ان کے کلام میں سرے سے یہ باتیں پائی ہی نہیں
جاتیں وہ نہایت پُرگو تھے، اُن کے اشعار کا شمار ہزاروں کیا لاکھوں تک ہے اخیر اخیر
میں وہ امیر انیس کی تقلید بھی کرنے لگے تھے، اس بنا پر ان کے کلام میں جا بجا شاعری
کے لوازم اور خاصے پائے جاتے ہیں، لیکن گفتگو قلت اور ندرت میں ہے، میر انیس کے
بہت سے اشعار میں فصاحت و بلاغت کا حصہ بہت کم ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ
دونوں میں سے نسبتہً کس کا کلام شاعری کے معیار پر پورا اُترتا ہے، میر انیس کا عجیب

ہنر تم دیکھ چکے، اب مرزا صاحب کے متعلق ہم ایک ایک چیز پہ تفصیل لکھتے ہیں۔
فصاحت۔ یہ امر بدیہی ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں وہ فصاحت اور شستگی
نہیں جو میر انیس کے کلام میں ہے، اور اس کے مختلف اسباب ہیں۔
(۱) مرزا صاحب اکثر ثقیل اور غریب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً
ع مستدعی شق القمر آگر ہوئے گمراہ
ع ہر کوہ کی آواز انا الطور انا الطور
النشر کا ہنگامہ ہے اس وقت حشر میں
لبیک و سعدیک تھا ورد ملک و حور
المنتہیٰ یہ ربط و ضبط اس دغا میں تھے
خاص الخلاصۂ بنی آدم، کمال ہیں
یارو اسنا مدائح نوشاہ کا بیان
رخ بنیہ صدق کرامات پیمبر
مستجمع جمیع فضایل، ملک سیر
مستغرق روح اس نے کیا تب غسل و شیر
لیکر رطب و لودوم کہنے لگے شاہ۔
میدانی و نقیب و عصادار و چوبدار۔
عرشی فلکی بڑھ کے نقیبانہ پکارے
اس قسم کے الفاظ ہیں، ہم نے صرف دو تین مرثیوں سے سرسری انتخاب کیا
ہے، ورنہ سینکڑوں ہزاروں تک نوبت پہنچتی، یہ الفاظ، اگرچہ صحیح ہیں، عربی اور فارسی

میں مستعمل ہیں لیکن اردو نظم کی سلاست و روانی ان کی متحمل نہیں ہو سکتی،
(۲) بعض الفاظ بجائے خود ایسے ثقیل اور گراں نہیں لیکن مرزا صاحب جن ترکیبوں کیساتھ اُن کو استعمال کرتے ہیں، اُن سے نہایت ثقل اور بھدّا پن پیدا ہو جاتا ہے یہ امر ان مثالوں میں واضح ہو جاتا ہے جہاں ایک ہی لفظ یا الفاظ کو میر و مرزا دونوں نے استعمال کیا ہے هل اتی انما قل کفی یہ چاروں لفظ حضرت علی کے فضائل کی تلمیحات (الیوزن) ہیں ان تلمیحات کو ایک ایک بند میں دونوں نے باندھا ہے مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

اہل عطا میں تاج سر هل اتی ہیں یہ	اغیار لاف زن ہیں، شہ لافتی ہیں یہ
خورشید اور فلک انما ہیں یہ	کافی ہی یہ شرف کہ شہ قل کفی ہیں یہ

ممتاز گو خلیل رسولان دین ہیں ہیں
کاشف ہی لوکشف یہ زیادہ یقین ہیں ہیں

میر انیس کہتے ہیں ؎

حق نے کیا عطا پہ عطا هل اتی کسے	حاصل ہوا ہے مرتبہ لا فتی کسے
کونین میں ہلا شرف انما کسے	کہتی ہے خلق، بادشہ قل کفی کسے

دنیا میں کون منتظم کائنات ہے
کس کو کہا خدا نے کہ یہ میرا ہاتھ ہے

مرزا صاحب کے کلام میں اس قسم کی ناموزونی نہایت کثرت سے ہے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ؎

ع اک شخص کمر شہ کی لگا باندھنے خورسند

ع اک دلو بھرو، پانی سے اور ایک رطب لو،
ع نوبت زن نہ بام عروج فلک پیر
ع ملبوس قلمکار نہ دوں ہے نہ پُرانا ؎

سہرے کو عوض پارۂ مدحت میں دھروں گا	شرح کہن ناطقہ منسوخ کروں گا

ع یہ صورت پیغمبر قوسین مکان ہے ؎

ہے طلعت، جلد و نفس سینہ یہ محسوس	وہ برق شفق میں نفع یہ پروانہ بہ فانوس
ناگاہ کھلا دشت میں بازار زد و کشت	تیغیں کھچیں یکدست تلے گز رہی بہشت

ع نہ چشم جراحت نہ رہ فوت کو دیکھا
کہتے ہیں جسے عاشق شیدا ملک و ناس
خیاط عہد طفلی شاہ انام تھے
اس کی ثنا مشقت مالایطاق ہے
نانا نے تو قلم کیے جبریل کے سہ پر ؎

کفار بڑھے طیش سہی ہونٹوں کو دبا کے	دانتوں کے تلے بال محاسن کے دبا کے

آمد ہے امام سوم ہر دوسرا کی، ؎

اس سر پہ دھرے ہاتھ بہ قصیہ اجل ہے	بس ہدیہ اللہ کے قابل یہی پھل ہے

بندش کی سستی اور ناہمواری میر انیس اور مرزا دبیر میں اصلی جو چیز بابالامتیاز ہے وہ الفاظ کی ترکیب نشست اور بندش کا فرق ہے میر انیس کا کلام تم پڑھ چکے ہو، اُنکا اصلی جوہر بندش کی چستی۔ ترکیب کی دلآویزی۔ الفاظ کا تناسب، اور برجستگی و سلاست ہے، یہ چیزیں مرزا صاحب کے ہاں بہت کم

ہیں، ایک ہی مصرعہ میں ایک لفظ نہایت بلند اور شاندار ہے دوسرا متبذل اور پست ہے، بند کا ایک شعر اس زور شور کا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرجتا آرہا ہے، دوسرا بالکل پھیکا اور کم وزن ہے، دو تین بند صاف اور سلیس نکل جاتے ہیں پھر تعقید اور بے ربطی شروع ہوتی ہے، اکثر جگہ الفاظ بڑے دھوم دھام کے ہیں لیکن حاصل کچھ نہیں یہ باتیں اگرچہ عام طور پر انکے تمام مرثیوں میں پائی جاتی ہیں لیکن نمونہ کے طور پر ہم چند بند اُن مرثیوں کے نقل کرتے ہیں جو بڑے زور کے مرثیے خیال کیے جاتے ہیں اور جن میں بعض میر انیس کے جواب میں لکھے گئے ہیں ؎

اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے	اے طنطنۂ طبع جرو کل کو ملا دے
اے جوہرۂ فکر فصاحت کو جلا دے	اے زمزمۂ نطق بلاغت کا صلا دے
اے بانیٔ بیان معنی تسخیر کو حل کر	
اے سین سخن قاف سے تا قاف عمل کر	

یہ مرثیہ میر انیس کے جواب میں ہے، کس زور شور کی اٹھان ہے، کیسے پُر رعب الفاظ ہیں لیکن معانی میں بہت کم ربط ہے، طنطنہ کو جرو کل کے ملا دینے سے کیا نسبت ہے زمزمۂ نطق سے بلاغت کا صلا مانگنے کی کیا معنی؟ بیان کی بکو تسخیر سے کیا خاص تعلق ہے؟ اسطرح سخن کی سین کو قاف سے قاف تک عمل کرنے کیلئے کیا خصوصیت ہے، ؎

بولا علم خامہ فلک پر میں گڑوں گا	سکہ نے ندا دی زر اجسم پہ پڑوں گا
معنی نے کہا بیت میں آئینہ جڑوں گا	مضموں پکارا میں کسی سے نہ لڑوں گا
بندش یہ کھلی دم میں فصاحت کا بھرونگی	
چلائی طبیعت کہ میں اصلاح کروں گی	

پہلے دو مصرعے کسقدر دھوم دھام کے ہیں، تیسرے میں تنزل شروع ہوا چوتھا بالکل گر گیا کیونکہ اوپر کے مصرعوں کی مناسبت کے لحاظ سے موقع یہ تھا کہ آپ بھی کوئی ایجادی دعویٰ کیا جاتا، مضمون کا نہ لڑنا اگرچہ معنیٔ تعریف کی بات ہے لیکن یہاں لڑائی سے گریز کرنے کا موقع نہیں، آخیر کا شعر اور خصوصاً اسکا دوسرا مصرعہ کسقدر پھیکا اور مبتذل ہے، طبیعت کے چلانیکا یہ کیا موقع ہے اور طبیعت کیلئے چلانا کتنا ناموزون لفظ ہے ؎

میں کون صاحب علم کاک جہانگیر	نوبت زن نہ بام عروج فلک پیر
تاج سر لفظ و سخن و معنی و تحریر	خاک قدم محتشم و امقبل شبیر

سنکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے
انصاف تو کہتا ہے خداوند یوں ہی ہے

پہلے تین مصرعوں کا جو انداز ہے، چوتھا مصرعہ اُس سے کسقدر بیگانہ ہے ؎

مضمون ہیں نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ	کہتا ہی سخن حضرت استاد ہمیشہ
کہنے میں ہے تاثیر خداداد ہمیشہ	بھولے سے بتا دوں تو رہے یاد ہمیشہ

بے لطف خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی
پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

جو چیز خداداد ہے اسکے لئے ہمیشہ کی قید حشو محض ہے، چوتھا مصرع تیسرے مصرع سے بالکل بے تعلق ہے، اُستادی کا ذکر دوسرے مصرع میں ہے، اور اُس کے ساتھ اس مصرع کو ربط ہو سکتا ہے، ٹیپ کے دو مصرعے بھی باہم بے تعلق ہیں۔

تین چار بند کے بعد فرماتے ہیں ؎

مضمون تر و تازہ ہے جس بیں لگانا
ملبوس قلم کار نہ دوں ہے نہ پرانا
اس دھیان کے آنے سے کرم شاہ کا جانا
خدام دلا بولے کہ ہاں ہاتھ بڑھانا

لے ہدیۂ تائید قدیر ازلی سے
لے خلعتِ تحسین حسینؑ ابن علیؑ سے

پہلے اور دوسرے شعر کی ترکیب اور انداز میں باہم کس قدر تفاوت ہے، دوسرا شعر پہلے سے بالکل الگ ہو گیا ہے، دوسرے شعر کی بندش ایسی ہے کہ مطلب بھی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ اس دھیان کا ستائش الیہ کون ہے ؎

حامی جو سلیمان دو عالم نظر آئے
مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کے آئے
طاؤس تصور کی طرح دل میں در آئے
شیشہ میں پری زاد معانی اتر آئے

یاقوت بدخشاں سے دُر آتے ہیں عدن سے
لعل اُگلوں گا میں طائر سدرہ کے دہن سے

حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے کیا تعلق ہے، تصور کی تشبیہ طاؤس کس بنا پر ہے اور پھر اُسکے کیا معنے کہ عنقائے مضمون دل میں نہیں اُترتا، اور اگر تصور کے طاؤس ہونے کی بنا پر ہے تو مضمون کا عنقا خود دل میں اُتر سکتا ہے، طاؤس کی مشابہت کی کیا ضرورت ہے، ٹیپ میں عجیب بے ربطی ہے شاعر لعل اُگلیگا لیکن طائر سدرہ کے دہن سے اُگلیگا اُسکے کیا معنے؟ شاید اُگلنے کو اُگلوانے کے معنی میں لیا ہے، یا اپنے آپ کو طائر سدرہ قرار دیا ہے ؎

کب شعلۂ خس لور کی قندیل کو پہنچے
اڑ کر نہ مگس طنطنۂ فیل کو پہنچے
پشہ کا نہ غُل صور سرافیل کو پہنچے
بلبل نہ لب و لہجۂ جبریل کو پہنچے

ارباب سخن پر جو سخن ور ہے ہمارا
القاب سخن سنج سخن ور ہے ہمارا

کسقدر بھدے الفاظ اور بھدی ترکیبیں ہیں۔ اسکے علاوہ بلبل کو دیکھو شعلہ کا مقابلہ قندیل سے نہیں بلکہ قندیل کی روشنی سے ہوسکتا ہے، پروار کو طنطنہ سے کیا نسبت ہے بلبل کو جبرئیل سے کیا مناسبت ہے لقب کی بجائے القاب باندھا ہے ۵

سرکار ہے ہر مجلس شبیر ہماری
آئینہ سکندر پہ ہے تسخیر ہماری

مضمون کی طرح بیت ہے جاگیر ہماری
ہے مہر سلیمان کی تحریر ہماری

تنہا مہ و ماہی پہ نہیں سکہ پڑا ہے
سورج کا نگینہ بھی انگوٹھی پہ جڑا ہے

بیت کا درجہ مضمون سے کم ہے، کیونکہ بیت کی جو خوبی ہے مضمون ہی کیوجہ سے ہے اس بنا پر یہ تشبیہ کہ مضمون کی طرح بیت ہماری جاگیر ہے، بے معنی ہے، جب مضمون جاگیر ہو چکا تو بیت خود ہی جاگیر ہوگئی، ٹیپ کا اخیر مصرع بالکل بیمعنی ہے، پہلے انگوٹھی سے کسی چیز کا استعارہ کرنا تھا، پھر سورج کا نگینہ جڑنا تھا ورنہ ظاہر ہے کہ ہاتھ میں پہننے کی انگوٹھی پر سورج کا نگینہ جڑنا کسقدر لغوبات ہے، ۵

قابل میں سخن کے ہوں سخن ہے مرے قابل
رضوان کو جنت یہ چمن ہے مرے قابل

لیکن سخن شہرہ فگن ہے مرے قابل
موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل

شہرہ ہے یہ تائید شہ جن و ملک سے
مضمون مرا پوچھتے آتے ہیں فلک سے

سخن شہرہ فگن نئی ترکیب ہے، ع رضوان کو جنت، یہ چمن ہے مرے قابل

ناموزون ترکیب ہے، یا تو یوں ہونا چاہیئے تھا کہ رضوان کو جنت چاہیئے اور مجھ کو یہ چمن، یا یوں کہنا تھا، کہ رضوان کے قابل جنت ہے اور میرے قابل یہ چمن، چوتھے مصرع کی ترکیب کا بھی یہی حال ہے، ٹیپ کے دونوں مصرعے قریباً باہم متناقص ہیں، شہر بھی انتہا کا ہے اور مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہی، شاید یہ مراد ہو کہ صرف نام مشہور ہو چکا ہی لیکن چونکہ مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی اور آستانۂ مبارک تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی، اسلئے گھر کا پتہ پوچھنا پڑا ؎

ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی	ہاں قلزم شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی
ہر بحر میں ہی بحر طبیعت کی روانی	ہے زور سخن شور پہ موجوں کی زبانی

قطرہ سے مگر بخت میں میں صرف نہیں ہوں
دریا ہوں سخن کا میں تنک ظرف نہیں ہوں

تیسرے فقرہ کا مطلب مشکل سے سمجھ میں آسکتا ہی، مقصد یہ ہے کہ زور سخن شور پر ہے لیکن اس بات کو میں نہیں کہتا بلکہ موج کی زبان کہتی ہے، بخت میں صرف ہونا کونسا محاورہ ہے، ٹیپ کے دوسرے مصرع میں "میں" کا لفظ لحظ فضول ہے پہلے مصرع میں میں کا لفظ آچکا ہے، ؎

خامہ ہے فروتن مرا از اطراف ادب سے	جھک کر شرفا اور بخیا ملتے ہیں سب سے
نخوت کے معانی ہیں الگ لفظوں کے لب سے	جس طرح سے بد اصل جدا نیک نصب سے

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو
مانند غبار اٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو

پہلے مصرع میں انکساری اور خاکساری کی بجائے ادب کہا ہے، حالانکہ دونوں

میں بہت فرق ہے، تیسرے مصرع کی ترکیب اور لفظ کے لب کا استعارہ سابق و لاحق کی سادگی و صفائی سے نہایت بیگانہ ہے، ؎

شیریں سخنی کا سبق اکبر سے لیا ہے
اس ذرہ میں سب مہر حسینی کی ضیا ہے

بیہمری افلاک سے گو خاک بسر ہوں
ہاں عیب بڑا یہ ہے کہ میں اہل ہنر ہوں

گو خاک بسر ہوں کا جواب، ہاں عیب بڑا یہ ہے کس قدر بے جوڑ ہے "میں" کا لفظ بالکل حشو ہے،

مرزا صاحب کا ایک اور نہایت مشہور مرثیہ ہے ؎

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے

رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
خود عرش خداوند زمن کانپ رہا ہے

شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

ہیبت سے ہیں نہ قلعہ افلاک کے در بند
واہے کمر چرخ سے جوزا کا کمر بند

جلا و فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
سیارے ہیں غلطاں صفت طائر پر بند

انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجہ سے علم چھوٹ پڑا ہے

یہ دونوں بند اپنے انداز میں پورے ہیں، اب تیسرا بند ملاحظہ ہو ؎

خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحہ خیر
کہتے ہیں انا العبد لرزکر صنم و دیر

جان غیر بدن غیر یکین غیر یمکاں غیر
نے چرخ کا ہی چرخ نہ سیارہ کی ہی سیر

سکتہ میں فلک خوف سے مانند زمیں ہے
جز بخت یزیداب کوئی گردش میں نہیں ہے

انا العید کس قدر سلاست کیخلاف ہے، یہ مصرع ع جان غیر بدن غیر لیکن غیر مکان غیر اس بند میں کسقدر بیگانہ واقع ہوا ہے ؎

بیہوش ہے بجلی پہ سمندان کا ہے ہشیار
خوابیدہ ہیں سب طالع عباس ہے بیدار
پوشیدہ ہے خورشید علم اُن کا نمودار
بے نور ہے مُنہ چاند کا رُخ ان کا ضیا بار

سب جزو ہیں کل رتبہ میں کہلاتے ہیں عباس
کونین پیادہ ہے سوار آتے ہیں عباس

یہ بند اوپر کے بند سے دفعتہً اسقدر بے تعلق ہوگیا ہے کہ مطلب سمجھنا مشکل ہے اُن کا مشار الیہ حضرت عباس ہیں، لیکن چونکہ حضرت عباس کا ذکر صرف پہلے بندوں میں آیا تھا جس سے تین بندوں کا فاصلہ ہے، اسلیئے ذہن اس طرف جلدی منتقل نہیں ہوتا مضمون کی بے ربطی کی یہ کیفیت ہے، کہ ایک طرف تو ہل چل کی وجہ سے بجلی کو بیہوش قرار دیا ہے، دوسری طرف فرماتے ہیں کہ سب خوابیدہ ہیں، ٹیپ کی بندش کی سستی خود ظاہر ہے ؎

چمکا کے مہ و خور زر و نقرہ کے عصا کو
سرکاتے ہیں پیر فلک پشت دوتا کو
عدل آگے بڑھا حکم یہ ہوتا ہے قضا کو
ہاں باندھ لے ظلم و ستم و جور و جفا کو

گھر لوٹ لے بغض و حسد و کذب و ریا کا
سر کاٹ لے حرص و طمع و مکر و دغا کا

ان استعارات میں جو لطافت ہے وہ ظاہر ہے،

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک مشہور اور معرکہ کے مرثیہ کے متعدد بند اس موقع پر نقل کر دیں جس سے مرزا صاحب کی طرز بندش کے تمام محاسن و معائب کا پورا اندازہ ہو سکے۔ یہ مرثیہ وہ ہے جس کو مرزا صاحب کے نامور معتقدین، اکثر مجالس میں بڑے فخر کے ساتھ پڑھتے ہیں ؎

پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی
پائی ہے کس پھریرے نے ہمت سحاب کی
یہ شان ہے نشان رسالت مآب کی
چوب علم کلید ہے جنت کے باب کی

نقشہ علم کے پنجہ میں اللہ کا ملا
بندوں کو اس نشان سے نشان خدا ملا

صبح جہاد شاہ ثریا جناب ہے
فوج حسین بن کے ظفر ہمرکاب ہے
مشرق سے واں علم علم آفتاب ہے
یاں نور کا نشان علم بوتراب ہے

روشن علم ہے آئینہ مشرقین ہے
مشرق میں شمس، عکس نشان حسین ہے

طوبیٰ کی شاخ تیشۂ قدرت نے کی قلم
اور نور نخل طور بھرا اس میں یک قلم
کی صاد قو نے راستی قول اس میں ضم
بے پردہ ہو کے عضو نبی پوشش علم

جب باندھکر پھریرے کو سیدھا علم کیا
صانع نے پردہ میں ید طولیٰ علم کیا

دامن ہے کبریا کا سراپردۂ جلال
ماہی مراتب اس کے ہیں شاہوں کا پائمال
پھہرا ہوا ہے شیر پھریرے کا بے مجال
شیر فلک کو دیکھ کے ہوتا ہے لال لال

تسخیر غرب و شرق اسے کیا محال ہے

پنجہ ہے آفتاب تو ناخن ہلال ہے

نورِ خدا سے قالبِ خیر الامم بنا
سایہ نبی کا ہو کے مجسم علم بنا
واں ابر چتر فرق نبی پر قدم بنا
یاں پوششِ علم۔ وہ سحاب کرم بنا

سب کام بند ہوں جو پھریرا نہ وا رہے
سچ ہے خدا کے فیض کا چشمہ کھلا رہے

اب رایت زبان سے مضمونِ علم کروں
اور نعتِ بلند کا لشکر بہم کروں
مجلس میں ذکر شقہ حالِ علم کروں
رایت ہیں سلک نظم کی پرچم کو ضم کروں

مشتاقوں کو زیارتِ رایت ضرور ہے
اس رایتِ نبی کی درایت ضرور ہے

جب شاہ انبیا کو ہوئی خواہش علم
آئی ندا فلک سے ابھی بھیجتے ہیں ہم
جاری ہوا یہ حکم خداوند محترم
ہاں قدسیو! علم کی درستی کرو بہم

تیار میرے دوست کی خاطر نشاں کرو
یعنی علم کی فکر سے خاطر نشاں کرو

تعقید مرزا صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت تعقید ہی ہے، وہ جہاں معنے آفرینی اور ندرت پسندی پر زیادہ توجہ کرتے ہیں کلام میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے وہ نہایت دقیق اور بلند مضامین پیدا کرتے ہیں لیکن مناسب الفاظ ہاتھ نہیں آتے اسلئے مضمون ایک گورکھ دھندا ہو کر رہ جاتا ہے۔

تلوار کی تعریف

مدنگر چشم نیام اوج پر آیا
اور صاف ہر اک فرد بشر کو نظر آیا

خط کھینچنے کو کلک دوات ظفر آیا
یا دوڑ کے ظلمت کی گلی سے خضر آیا

دل شور تھا پیدا مہ نو سے مہ نو ہے
یاں غل تھا جدا شمع سے یہ شمع کی لو ہے

آمد کی دھوم

خود ابر فلک گرد سواری میں گھرے ہیں
دریا میں عدو ڈوبے دو زخ میں ترے ہیں
یوں کانپے سراروں کے منہ رنگ سے پھرے ہیں
بت حرص کے طاق دل اعدا سے گرے ہیں

عشرہ ہے فقط، ہاتھ نہیں پاؤں نہیں ہے
دہشت کی سبب دھوپ نہیں چھاؤں نہیں ہے

سراپا۔

معراج پیمبر کی تو روشن ہے حقیقت
یاں دیکھو تہ عرش جبیں چشم کی زینت
اُترا ہے نبی کیلئے یہ کاسۂ نعمت
ہم صحبت و ہم کاسہ ہیں معبود سے حضرت

اس کاسہ میں یہ تہ ہے یہ پلکوں کی تہ کا
اک ہاتھ نبی کا ہے اور اک ہاتھ خدا کا

اب مومنوں کو عالم بالا کی خبر دوں
حل عقدۂ مدح سر اقدس کو بھی کر دوں
گردوں کو میں نسبت سر پر نور سے گردوں
یہ عرش ہو اور عرش بنے رشک سے گردوں

اک قامت احمد ہے، اسی فوق جہاں پر
خورشید سے اک نیزہ سوا ہو گا سناں پر

گو غنچہ ہے گوش پسر سید خوشخو
قرب ختن زلف سے پرزلفی کی ہے بو
اور حلقۂ گیسو کہ ہے اک نافۂ آہو
ہے کان کی نکہت سی رگ غنچہ ہر اک مو

نافہ کا شرف غنچہ کو کاکل نے دیا ہے
اور گوش کے نافہ کو یہاں غنچہ کیا ہے

خط حسن کی خاطر ہے خزاں کا خط فرماں
صرصر سے ہے ایمن یہ چراغ رخ تاباں

یاں حلقۂ خط حسن کو ہی چشم نگہباں
عارض کو کیا خط نے چراغ تہ داماں

گلشن ہے غلط اور غلط ابر بہاری
رخ باغ بہاری ہے یہ خط ابر بہاری

ایک اور مرثیہ میں فرماتے ہیں ؎

نام جبیں ہے مشرق خورشید ہر امید
ہے صبح صادق اسکی گواہی سی رو سپید

یاں پھول سر کو ملیں، پھل ہو نصیب بید
مہر قبول کے اثر سجدہ سے نو دید

اکبر نشان سجدہ جبیں پر دکھاتے ہیں
یا سر نوشت نیر اکبر دکھاتے ہیں

کیا شاہ بیت ابروے اکبر کی ہو ثنا
بیت القصیدہ ہے خم ابروے مصطفےٰ

یکتا مطالعہ میں ہے یہ مطلع رسا
کیا بیت بخشی ان سی کرے ماہ نو بھلا

پیش نگہ یہ بیت ہے اٹھارہ سال سے
آتی ہے بوئے شیر دہان ہلال سے

تشبیہات و استعارات

مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی دقت آفرینی سے ایسے عجیب اور نادر تشبیہات اور استعارات پیدا کرتے

ہیں جن کی طرف کبھی کسی کا خیال منتقل نہیں ہوا ہوگا، لیکن اس زور میں وہ اکثر اس قدر بلند اڑتے ہیں کہ بالکل غائب ہو جاتے ہیں مثلاً ۵

شمشیر نے جل تھل جو بھرے قاف تا قاف
پریاں ہوئیں مرغابیاں، گرداب بنا قاف
پھینے کیلئے خوف سے اسد رجہ گھٹا قاف
جو بیچ میں سیمرغ کی منقار کی تھا قاف

کیا جانے کدھر لیکے خزانہ وہ بہا تھا
قاروں کو عذابِ ابدی ڈھونڈھ رہا تھا

تیغ عباسؑ جو داماں زرہ میں تھی نہاں
یا شبستاں میں وہ خوابیدہ تھا مار دو زباں

چمکا وہ ہلال ابر روئے یوسف کا کنوئیں سے
یا برق جدا ہو گئی بادل کی دھوئیں سے

مدِ نگہ چشم نیام افوج پر آیا
اور صاف ہر ایک فرد بشر کو نظر آیا

خط کھینچنے کو کلک دوات ظفر آیا
یا دور کے ظلمت کی گلی سے خضر آیا

گرمی پہ شرر تیغ شرر دم کے جو آئے
جوہر نے کنوئیں قعر جہنم کے جھکائے

تھی مرغ نگہ پردوں میں پر اس نے جلائے
عنقائے تصور کے کباب اس نے لگائے

ظلمات میں یہ فتح پہ قبضہ گئی پھری
یونسؑ کو جیسے بطن میں مچھلی لئے پھری

چہرہ سے بینی صف لشکر بھی دور کی
بتخانہ سے شباہت ممبر بھی دور کی

کاف تشکاف بن کے درونِ جگر گئی
مانند سیم مرگ میان کمر گئی

لفظِ شکم میں دینے کو زیر و زبر گئی
مانند پیش ہر جزو کل سے گذر گئی

رن کی صفوں کا خوف سے ستھراؤ ہو گیا
پانی ہوئے یہ ڈر سے کہ چھڑکاؤ ہو گیا

بینی جبین و لب سے حسین و خلیل ہے
سر پر ہے عرش زیر قدم سلسبیل ہے

نبضیں چھٹیں شرر کی، سفر کانپنے لگے
شعلے زبان نکال کے خود ہانپنے لگے

نہیب تیغ سے خالی سبھوں کے قالب تھے
پیالہ ہائے فلک روحوں سے لبالب تھے

گیا جو فوق سے تحت الثری کو آب حسام
بنا خزانۂ قاروں خرابۂ حمام

فلک نے تختۂ یوناں رکھا زمیں کا نام
ہوا رطوبتِ اطراف سے زمیں کو زکام

دماغ خاک پہ یہ نزلہ بہ صد وفور گرا
کیا جو عطسہ تو قاروں نکل کے دور گرا

جوہر میں طرفہ ہیبت تیغ دلیر ہے
مچھلی کے جال میں یہ مگر کوئی شیر ہے

بادل کی طرح جوہر شمشیر جو چھائے
سایہ نے تڑپ کر دلِ رعد سجائے

چار آئینہ نے اور ہی صورت دکھائی ہے
پر آئینہ نہیں ہے سند ہم نے پائی ہے

زائل زرہ کی آنکھوں سے جو روشنائی ہے
آنکھوں نے چار چشمہ کی عینک لگائی ہے

ڈر ڈر کے آب تیغ سے سب کوچ کر گئے
غصہ سی ہو کے چین جبیں کچھ ٹھہر گئے

پل بن گئے وہ چین جبیں سر اتر گئے
اک وار میں فرات سی یاراں کی سر گئے

پر ذوالجناح صاف دھویں سے نکل گیا
بارود تھا کہ اڑ کے کنویں سے نکل گیا

تھا طوطی خط پشت لب لعل پر گویا
دیکھو کہ دھواں آتش یاقوت سی نکلا

تھا چاہِ ذقن میں چہ نخشب کا نخلا
اس چاہ کی کشتی نے تو پانی بھی نہ مانگا

جلوے لب و دنداں کی عجب پیش نظر تھے
دروازے پہ یاقوت تھے اور گھر میں گہر تھے

حاشا نہیں تجلی ماہ آسمان پر
مچھلی اچھالتی ہے کلاہ آسمان پر

چشم ضیا فشاں سے نمود چراغ ہے
پلکیں نہ سمجھو ہالۂ دود چراغ ہے

پیدا کمر سے کینہ حباب آلہ ہے
یہ بال چشم ناف کا تار نگاہ ہے

پتلی ہے کوہِ طور تجلی کبریا
جبتک یہ پلکیں دستِ نگہ بن نہ دیں عصا

سنتے تھے تل کی اوٹ پہاڑ اب نظر پڑا
موسیٰ کی بھی نگہ نہ ہوا اُس پہ رسا

اک جلوہ دے یہ چشم جسے اپنے نور کا
وہ خاک کے بھی مول نہ لے سُرمہ طور کا

سجنے لگا سلاح دغا پھر وہ پُر دغا
یا ماہ آفتاب کو گویا گہن لگا

کی خود نے خود نمائی سے زیبِ سر جفا
یا دار قد پہ کفر کا بختِ سپر جڑا

اسلام میں جو ڈالے ہیں رخنے یزید نے
ان رخنوں کو کیا درہ تن پلید نے

پاؤں میں پہنے موزہ گمراہی جہاں
اور تیغ ہند ہند جگر خوارہ کی زباں

کج فہمی معاویہ کی اُس نے لی کماں
فرد سپر تھی نامۂ اعمال شامیاں

چار آئینہ وہ زنگ بھرا اُس پہ چپکلے
دل شمر و شیبت و ابن زیاد و یزید کا

مضمون بندی اور خیال آفرینی میر انیس اور مرزا دبیر میں اصلی بالامتیاز جو چیز ہے وہ خیال بندی اور دقت پسندی ہے اور یہی چیز مرزا صاحب کے تاج کمال کا طرہ ہے، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے وہ اس قدر دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک اُنکے حریفوں کا طائر وہم پرواز نہیں کر سکتا۔ راست نما اور دلفریب (لیکن غلط) استدلال جو شاعری کا ایک جزو اعظم ہے اُنکے ہاں نہایت کثرت سے پایا جاتا ہے، وہ قوت متخیلہ کے زور سے نئے اور عجیب دعوے کرتے ہیں، اور خیالی استدلال سے ثابت کرتے ہیں مبالغہ کے

مضامین جو پہلے شعرا باندھ چکے تھے اور بظاہر نظر آتا تھا کہ اسکی حد ہو چکی، اُن کو وہ اسقدر ترقی دیتے ہیں کہ پہلے مبالغے، اُن کے مقابلے میں ہیچ ہو جاتے ہیں۔
مختصر یہ کہ خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت اشعارات، اختراع تشبیہات شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ میں اُنکا جواب نہیں، لیکن اس زور کو سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے، کہیں تعقید اور اغلاق ہو جاتا ہے، تشبیہات کہیں پھیتیاں بنجاتی ہیں، اور کہیں محض فرضی خیال رہ جاتی ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اُتر جاتا ہے نہایت بلند رتبہ ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر ہم ان کے ہر قسم کے عمدہ مضمون آفرینی کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں ؎

جب سرنگوں ہوا علم کہکشان شب
خورشید کے نشان نے مٹایا نشان شب
تیر شہاب سے ہوئی خالی کمان شب
تا نی نہ پھر شعاع قمر نے سنان شب

آئی جو صبح دیور جنگی سنوار کے
شب نے زرہ ستارونکی رکھدی اُتار کے

شمشیر مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب
پھر تیغ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب
تھا بسکہ گرم خنجر بیضائے آفتاب
باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب

محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

تھی جوش خون کی عارضہ میں مبتلا شفق
فصاد صبح آیا لئے نشتر و طبق

لہ اس کے مقابلہ میں میر انیس کی صبح دیکھو ۱۲

کھولی شفق کی صبح تو رنگ افق تھا زرد
گلرنگ تھا صحیفۂ گردوں ورق ورق

خونِ شفق میں سُرخ قضائے قلم کیا
اور خط و خال روزِ شہادت رقم کیا

ایضاً

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
پنہاں درازیِ پرِ طاؤس شب ہوئی

اور قطعِ زلف لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک شب ہوئی

فکرِ رفو تھی چرخِ ہنرمند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

یوسف غریقِ چاہِ سیہ ناگہاں ہوا
یعنی غروبِ ماہ تجلّی نشاں ہوا

یونس دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا
یعنی طلوعِ نیّرِ مشرق ستاں ہوا

فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

تھی صبح یا کہ چرخ کا جیبِ دریدہ تھا
یا چہرۂ مسیح کا رنگ پریدہ تھا

خورشید تھا کہ عرش کا اشکِ چکیدہ تھا
یا فاطمہؑ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا

کہیئے نہ مہرِ صبح کے سینہ پہ داغ تھا
امیدِ اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

نکلا افق سے عابد روشن ضمیرِ صبح
محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پذیرِ صبح

کھولا سپیدی نے جو مصلائے پیرِ صبح
ہر سجدہ گاہ بن گیا مہر منبرِ صبح

کرتی تھی شب غروب کا سجدہ وداع کو

سیارے ہفت عفو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینہ سے دُور ہو گیا

پھر مشک شب جہان سے کافور ہو گیا
باطل رسالۂ شب دیجور ہو گیا

کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضموں تھا آفتاب کا ذروں کے نامے میں

ایضاً

صبح

گلگونۂ شفق جو ملا حور صبح نے
گرمی دکھائی روشنیٔ طور صبح نے

اسپند مشک شب کو کیا نور صبح نے
ٹھنڈے چراغ کر دیئے کافور صبح نے

لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے مہر درخشاں کی چھٹ گئی

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشان صبح
باندھا عمامہ نور کا پہنا کتان صبح

سلطان صبح نے کیا قصد اذان صبح
چرخ چہارمیں پہ گیا خطبہ خوان صبح

مُنہ سب کے سوئے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرم سجدہ عیسیٰ و خورشید ہو گئے

آیا جو تیغ روز لیئے شاہ نیمروز
باندھے کمر میں خنجر بیضائے کینہ سوز

ماہی شکار شیر سوار دو جہاں فروز
پھر دیو ہفت سر ہوا صید عقاب روز

مہتاب لشکر شہ خاور میں گھر گیا
آرہ شعاع کا سر انجم پہ پھر گیا

پڑھکر نقیب نور پکارا سحر سحر
ذرّوں میں نور مہر ور آیا قمر قمر

فرمان نور بدر کو پہنچا بدر بدر
لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر

بُرقع جو اُٹھ گیا تھا رُخِ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبح ملمع نقاب کا

شاخِ نیام سے ہُوا اس طرح پھل جُدا
پیروں کے قد سے جیسے جوانی کا بل جُدا
ہستی جدا زمین پہ تڑپی اجل جدا
خنجر جُدا فلک پہ گرا اور زحل جُدا

تلوار

غل تھا کہ اب مصالحۂ جسم و جاں نہیں
لو تیغ برق دم کا قدم درمیاں نہیں

ڈوبی سپر میں گر کے نئی چال ڈھال سے
پاکھر کے بیچ میں یہ پڑھی سیدھی چال سے
اُٹھ کر زرہ میں آئی شکوہ و جلال سے
اک جال میں تڑپ کر گئی ایک جال سے

گذری جو چار آئینہ سے منھ کو موڑ کے
غل تھا پری نکل گئی شیشہ کو توڑ کے

کاٹا پلک میں آنکھ کو پتلی میں نور کو
پاؤں میں کجروی کو سروں میں غرور کو
سینہ میں بغض و کینہ کو دل میں فتور کو
نیت میں معصیت کو طبیعت میں زور کو

ذات اک طرف، مٹا دیا بالکل صفات کو
کیسی زباں، زباں میں کاٹ آئی بات کو

سب کے گلوں سے ملتی تھی لیکن رُکی ہوئی
جوہر یہ تھا کہ بوجھ سی خود تھی جھکی ہوئی

ولہ

ظرف تنگ میں تھی نہ جگہ اسکی آب کی
بندھتی تھی اور کھلتی تھی مٹھی حباب کی
دریائے خوں تھا تیغ سبک رو کی ناؤ پر
پرلی رواں تھی جیسے کہ کشتی بہاؤ پر

ولہ

اللہ رے شناور شمشیر آبدار
دکھلا دیئے صفائی کے سب ہاتھ ایکبار

تیر اوہ جوے زخم میں گہ وار۔ گاہ پار
جوہر کا ایک بال بھی ڈوبا نہ زینہار

اک وجد حر کو بھی یہ صفا دیکھ کر ہوا
ہاتھ اک طرف نہ تیغ کا ناخن بھی تر ہوا

جس مورچہ میں لیلی تیغ دوسر گئی
چنگے بھلوں کو سایہ سی دیوانہ کر گئی

ہر صف نے خاک اڑائی ادھر سے ادھر گئی
پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی۔ کبھی پیچھے کو پھر پڑی
سر پر جو اڑ کھڑائی تو شانے پہ گر پڑی

اٹھی۔ گری۔ بلند ہوئی۔ پست ہو گئی
پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی

تیرے تنے تو اس نے کہا دیکھے بھالے ہیں
بخشی نہ خضر سے کہ گودی کے پالے ہیں

برسے جو تیر سمجھے کمانوں کے نالے ہیں
چمکے جو گرز۔ بولی۔ یہ منہ کی نوالے ہیں

ننگ اپنا جان کر نہ کسی سے پکڑتی تھی
ہر پھر کے آپ اپنی طبیعت سے لڑتی تھی

ہجرم معرکہ میں وہ خارا شگاف تھی
لشکر کا خوں کیا تھا مگر پاک و صاف تھی

قبضہ تو رہا دست جناب شہ دیں میں
پھل جا کے لگا شاخ سر کاؤ زمین میں

اس فہر مجسم پہ اجل نے جو نظر کی
مجرا تو فقط کر لیا اور پیچھے کو سر کی

غصہ سی چڑھی بھوں جو ادھر تیغ دوسر کی
پھرنے لگی پتلی سپر فوج عمر و کی

باقی نہ تھا نہ دم خوف سے تیغیں یہ گھٹی تھیں
تیغیں نہ کہو، نبضیں نیاموں کی چھٹی تھیں

خود رفتہ تھا ہر تیغ یہ رفتار نئی تھی — انگڑائی کا لینا بھی کمان بھول گئی تھی
تھی راست گو وہ تیغ یہ روشن جہاں یہ تھا — جتنا لہو پیا تھا وہ جاری زباں پہ تھا
کٹتے تھے سر نہ تیغ امام عراق سے — بُت گر رہے تھے خاک پہ کعبہ کے طاق سے
سر کو نہ وصل تیغ سے اصلا دریغ تھا — کیا سب کی سرنوشت میں مصراع تیغ تھا
رک رک کے قدم رکھتی تھی ہر سر پہ ادب سے — جھک جھک کے مثال شرفا ملتی تھی سب سے
جوہر کے نگہبانوں کو بیدار جو پایا — زخموں نے بھی اس تیغ کا پانی نہ چرایا
ہوتی تھیں صفیں اب دم تیغ سے بیدم — پانی جو کھڑے ہو کے پیو ہوتا ہے کم سن
ہل کرتی تھی ہر مسئلہ تیغ شہ عالم — ہے خون نجس اس میں یہ آلودہ بھی ہر دم

پر اس میں نجاست کا گماں ہو نہیں سکتا
یعنی کہ جنس آب رواں ہو نہیں سکتا

اللہ رے دماغ اس کا کسی سر پہ نہ بیٹھی — سر ایک طرف گنبد مغفر پہ نہ بیٹھی
بالائے سپر پھولوں کی بستر پہ نہ بیٹھی

یہ بیٹھنا کب تھا، ادھر آئی اُدھر آئی
جس سر پہ رکھا پاؤں زمیں پر اُتر آئی

اسی طرح گھوڑے کی سرعت، فوج کی، ہلچل، آمد کی دھوم، وغیرہ وغیرہ مضامین میں سینکڑوں ہزاروں نئی تشبیہیں، استعارات، اور باریکیاں پیدا کی ہیں ہم نے اس جدل سے صرف نمونہ پر اکتفا کیا کہ ایک شخص ایک تلوار کے متعلق اسقدر بیشمار مضامین کا

مینہ برسا سکتا ہے، اسکی قوت متخیلہ کی کیا حد ہو سکتی ہے۔

بلاغت

یہ وہ چیز ہے جہاں انیس، اور دبیر کی شاعری کی سرحدیں، بالکل الگ ہو جاتی ہیں مرزا صاحب کی شاعری میں، بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں لیکن بلاغت کا تو شائبہ نہیں پایا جاتا۔

تم اوپر پڑھ آئے ہو کہ ہر چیز کی بلاغت الگ ہے مضمون کی الگ، قصہ کی الگ، قصیدہ کی الگ، شعر کی الگ، لیکن مرزا صاحب کے کسی قسم کے کلام میں یہ وصف پایا نہیں جاتا۔ وہ اگر کسی واقعہ کا خاکہ تیار کرتے ہیں تو اس قسم کی باتیں بیان کرتے ہیں جو خود شہادت دیتی ہیں کہ واقعہ وجود میں نہیں آسکتا۔ نوحہ و غم، فخر و ادعا، طنز و تشنیع، ہجو و بدگوئی، سوال و جواب، گلہ و شکایت، غرض کسی مضمون کو وہ مقتضائے حال کے موافق نہیں لکھ سکتے۔

ہم چند مثالیں نمونہ کے طور پر لکھتے ہیں۔

مثال ۱۔ ایک مرثیہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر، حضرت شہر بانو کا جو نوحہ لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں ؎

تم جاؤ جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ	اکبر سے میں گذری مرے والی کو لے آؤ

"تم جانو جہاں سے" اس محاورہ کی ابتذال سے قطع نظر کر کے یہ امر کسقدر خلاف مقتضائے حال ہے، کہ کوئی شریف عورت یہ کہے کہ میں اپنے بیٹے سے درگذری میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کرو،

مثال ۲۔

ناگہاں بالی سکینہ نے مچل کر یہ کہا
میرے کُرتے کا گریباں بھی کرو چاک چچا

خوب ملبوس ہی پہنیں گے ہم بھی ایسا
روٹھ جاؤنگی نہ مانوگے جو میرا کہنا

آپ جب خیمہ میں آئینگے تو چھپ جاؤنگی
پھر مجھے گود میں لوگے تو نہ میں آؤنگی

روئے ناداں کی تقریر پہ عباسؑ کمال
اور کہا دل ہی کہ اسکا بھی کرو ردّ سوال

بے پدر ہوگی کوئی آن میں نیکخصال
چاک اُس کا بھی گریبان کیا با حزن و ملال

پیار جو آگیا بنتِ شہِ دیں کے اوپر
بوسے دے دیکے ملی خاک جبیں کے اوپر

واقعہ یہ بندھا ہے کہ حضرت عباسؑ جب میدان میں جانے لگے تو اپنے بیٹے کا گریبان چاک کردیا کہ یتیمی کی علامت ہی، یہ دیکھ کر سکینہؑ (حضرت امام حسین کی صاحبزادی) نے کہا کہ میرے کُرتہ کا گریبان بھی چاک کردو، مجھ کو بھی یہ وضع اچھی معلوم ہوتی ہے، حضرت عباسؑ نے اِس خیال سی کہ آخر حضرت امام حسین بھی کچھ دیر میں شہید ہونگے اور حضرت سکینہؑ بھی یتیم ہوجائینگی، اسلئے اُن کا گریبان بھی چاک کردیا۔ حضرت عباس کو امام علیہ السّلام سے جو عشقیہ محبت تھی اور جسکا اظہار ہر جگہ مرزا صاحب نے بھی کیا ہے اسکے لحاظ سے یہ امر نہایت خلاف عقل اور خلاف عادت ہے کہ وہ حضرت امام حسینؑ کو قبل از وقت شہید فرض کرلیں، اس بنا پر اُنکے بچہ کو یتیم فرض کرکے اسکا گریبان چاک کردیں۔

مثال ۳۔ ۵

یہ کہتی تھی کہ آئی قریب بنت مرتضیٰ	تسلیم کرکے بانو نے سر کو جھکا لیا
زینبؑ پکاری بیٹھو ادب میرا ہو چکا	جسکی نہ بات پوچھئے تعظیم اسکی کیا
سب جانتے ہیں بنت جناب امیرؑ ہوں	
گھر میں تمہارے رہتی ہوں اس سے حقیر ہوں	

حضرت زینبؑ کو اس بات کی شکایت ہے کہ علی اکبرؑ کو شہر بانوؑ نے بغیر میری اطلاع کے لڑائی میں جانیکی کیوں اجازت دی۔ اس بنا پر وہ حضرت شہر بانوؑ سے کہتی ہیں کہ جب میری بات نہیں پوچھی جاتی تو تعظیم سے کیا فائدہ؟ لیکن اس مقصد کے اظہار کیلئے مرزا صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ کس قدر سفیہانہ اور عامیانہ ہے، یہ خیال کہ میں چونکہ اپنا گھر چھوڑ کر تمہارے گھر میں رہتی ہوں اسلئے تم لوگ مجھے حقیر سمجھتے ہو، نہایت پست اور مبتذل خیال ہے جو ہرگز حضرت زینبؑ کی متانت اور وقار کے شایاں نہیں۔

مثال ۴۔

محبوب ہوں خدائے ذوی الاحترام کا	نانا ہوں میں حسین علیہ السلام کا

یہ شعر جناب رسول خدا کی زبان سے ادا کیا ہے، لیکن مرزا صاحب کو یہ خیال نہیں رہا کہ آنحضرت بھی امام حسین علیہ السلام کا نام علیہ السلام کہکر لیتے تھے۔

مثال ۵، ۶

یہ بات سن کے بنڑی نے گھونگٹ الٹ دیا	عباسؑ کو حسینؑ کو اکبرؑ کو دی صدا
صدقے میں تم یہاں سے سرک جاؤ اک ذرا	تم سب کے آگے روتے ہوئے آئیگی حیا
ماتم کا ہے ہجوم دل پاش پاش پر	

جی بھر کے روئے یہ بنے قاسم کی لاش پر

سرکے وہاں سے اکبرؑ و عباسؑ و شاہ دیں
لاشہ کے گرد پھرنے لگی وہ دلہن حزیں
زینبؑ سے پوچھنے لگی پھر وہ مہ جبیں
اب اختیار دل پہ مرے مطلقاً نہیں

نو شاہ ایک رات کے جو قتل ہوتے ہیں
بتلاؤ اے پھوپھی! انہیں کیا کہہ کے روتے ہیں

یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مرزا صاحب، اور دیگر تمام مرثیہ گویوں نے اہل حرم کی عادات اور مراسم، ہندوستان کے شرفا کی مستورات کے مطابق فرض کیئے ہیں چنانچہ عروسی، شادی، اور میت کے متعلق جس قسم کے مراسم و عادات یہاں ہیں وہی تمام مرثیوں میں مذکور ہیں، اس بنا پر حضرت کبریٰ کا اپنے باپ، چچا اور بھائی سے یہ کہنا کہ تم لوگ یہاں سے سرک جاؤ میں اپنے شوہر پر نوحہ کرنا چاہتی ہوں کس قدر بیحجابی اور بے شرمی ہے طرہ یہ کہ یہ بھی کہتی ہیں کہ تم سب کے آگے روتے ہوئے شرم آئیگی لیکن یہ کہتے ہوئے شرم نہ آئی۔ مرزا صاحب نے اس واقعہ کو ایک اور مرثیہ میں لکھا ہے اور وہاں تو حد کر دی ہے، فرماتے ہیں ؎

ناگاہ شہ نے لاش اٹھائی بصد بکا
کبریٰ نے ہاتھ باندھ کے تب شاہ سے کہا
ہم کچھ کہیں جو چاہیئے اے شاہ کربلا
احسان ہوگا لاش کو رکھ دیجئے ذرا

بالیں پہ پٹیں سر پہ ذرا خاک ڈال لیں
ہم بھی کچھ اپنے دل کی تمنا نکال لیں

میر انیس نے اسی واقعہ کو کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

رو کر بہن سے کہنے لگے شاہ بحر و بر
اس بے نصیب رانڈ کو لے آؤ لاش پر

بیٹی لٹے گی یوں ہمیں اسکی نہ تھی خبر
اب شرم کیا ہے دیکھ لو دولہا کو اک نظر

زخمی بھی ہے شہید بھی ہے بے پدر بھی ہے
دولہا ہے نام کو بھی چچا کا پسر بھی ہے

اس بلاغت کو دیکھو کہ چونکہ حضرت امام حسین کا بھی یہ کہنا کہ اب شرم کیا ہے دولہا کو دیکھ لے، ایک گونہ رسمی حیا کے خلاف تھا اس لئے ان کی زبان سے یہ الفاظ ادا کئے کہ وہ برائے نام دولہا ہے ورنہ چچا کا بیٹا بھائی ہے ۵

حضرت یہ کہہ کے ہٹ گئے با چشم اشکبار
پیٹی یہ سر کو غش ہوئی بانوئے دلفگار

چادر سپید اوڑھا کے دولہن کو بحال زار
گودی میں لائی زینبِ غمگین و سوگوار

چلائی ماں یہ گر کے تنِ پاش پاش پر
قاسمؑ بنے اٹھو دولہن آئی ہے لاش پر

ہے ہے بنے قاسمؑ کا ہوا شور جو در پر
بانو نے کہا لٹ گئی لوگو امری دختر

فرزند کے لاشہ سے لپٹنے لگی مادر
سر پیٹتی دوڑی شہ مظلوم کی خواہر

پھر کون رہے بنت علیؑ جب نکل آئے
خیمہ میں دولہن رہ گئی اور سب نکل آئے

مثال ۶،

کہا سجادؑ سے کبریٰ نے یہ اس دم رو رو
بھائی صاحب مرے دولہا کو بھی اب دفن کرو

تا مجاور میں بنوں کھول کے اپنے سر کو
کہا کبریٰ سے یہ سجادؑ حزیں نے کہ چلو

ٹکڑے لاشوں کے بہم بادل غمناک کریں
قاسم ابن حسنؑ کو بھی تہِ خاک کریں

ایک رات کی بیاہی ہوئی عورت کا، اپنے بھائی سے یہ کہنا کہ میرے دولہا کو بھی دفن کرو۔ کس قدر خلاف عادت ہے۔

مثال ۷، حضرت سکینہؓ کو قید خانہ میں غش آگیا ہے، اُنکی ماں حضرت شہربانو کو خیال ہوا کہ مر گئیں، اُنہوں نے نوحہ شروع کیا۔ حضرت زینبؓ اُنکو سمجھاتی ہیں اس واقعہ کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

زینبؓ نے رو کے بانوئے مغموم سے کہا	بے آس ہو نہ بھابھی ہے غش میں یہ سہ لقا
اور مر گئی تو خیر جو اللہ کی رضا	اب اس کے رفع غش کی یہ اسوقت ہے دوا
ہے عاشق حسین یہ پیاری حسینؓ کی	
اب غُل کرو کہ آئی سواری حسینؓ کی	

تسکین اور تسلی دینے میں یہ کہنا خیر مر گئی تو کیا کروگی، جو اللہ کی رضا، کس قدر ناموزون ہے اور خلاف آدمیت ہے،

یہاں ہم نے اجمالاً صرف چند مثالیں لکھدیں اس کے بعد متحد المضمون مرثیے کا جو عنوان ہے اُس سے تفصیلاً معلوم ہوگا کہ مرزا صاحب بلاغت کی راہوں سے کسقدر ناآشنا ہیں۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کا صحیح تر اور آسان طریقہ یہ ہے کہ دونو صاحبوں کے ہم مضمون مرثیوں کا مقابلہ کیا جائے، چونکہ مرثیہ کا موضوع، صرف چند معین واقعات ہیں اسلئے اگرچہ دونوں صاحبوں کا انداز شاعری بالکل الگ الگ ہی، تاہم واقعات اور مضامین میں ہر جگہ اشتراک پیدا ہو جاتا ہے، اسکے ساتھ یہ بھی نظر آتا ہی کہ دونوں حریفوں نے اکثر مرثیے، اور بند، اور متفرق اشعار، ایکدوسرے کے مقابلہ میں لکھے ہیں، یہاں تک کہ بعض بعض بندوں میں مضمون، ردیف، اور قافیہ تک مشترک ہیں، افسوس کہ ان موقعوں پر یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ابتدا کسنے کی، اور جواب کس نے لکھا، تاہم بعض بعض قرائن سے (جیسا کہ ہم دیباچہ میں لکھ آئے ہیں) ثابت ہوتا ہی کہ مرزا دبیر صاحب زیادہ تر مقابلہ کا قصد کرتے تھے مثلاً ایک مرثیہ میں میر انیس نے فخریہ کیسا زمانہ کی ناقدری کی شکایت کی تھی، اُسکے ایک بند کی ٹیپ یہ ہی ؎

عالم ہے مگر کوئی دل صاف نہیں ہے	اس عہد میں سب کچھ ہی پر انصاف نہیں ہے

اسی بحر میں مرزا دبیر صاحب کا بھی مرثیہ ہے، اس میں بھی فخریہ ہے، اور ایک بند کی ٹیپ یہ ہے ؎

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے	انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

دونوں شعروں کو دیکھکر ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہی کہ کس نے کس کا جواب لکھا ہے۔

میر انیس اکثر شعروں میں مرزا دبیر پر سرقہ اور خوشہ چینی کی چوٹ کرتے ہیں ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار	خبر کرو مرے خرمن کی خوشہ چینوں کو

ع پیاسو! پیو سبیل ہے نذر حسینؑ کی ۵

ممکن نہیں دزدان معانی سے نجات	سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے
بھلا ترددِ بیجا سے اس میں کیا حاصل	اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
نواسنجیوں نے تری اے انیس	ولہ ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

ع مضمون انیس کا نہ چرایا اترا،

لیکن مرزا دبیر نے میر انیس پر کہیں سرقہ کی تعریض نہیں کی ہے بلکہ صرف اپنی برات ظاہر کی ہے مثلاً ۵

واللہ بری ہوں سرقۂ مضمون غیر سے	ہے استفادہ مجھ کو احادیث و سیر سے
شکرِ خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں	ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں

بہرحال کم سے کم ہم کو یہ فرض کر کے کہ دونوں میں سے کوئی سرقہ کا مجرم نہیں، صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس مضمون کو کس نے خوبی سے ادا کیا ہے، چنانچہ ہم دونوں کے متحد المضمون مرثیے اور اشعار ذیل میں درج کرتے ہیں۔

پردہ کا اہتمام

بیت الشرف خاص سے نکلے شہ ابرار	انیس	روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترت اطہار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار		پردہ کی قناتوں سے خبردار خبردار

باہر حرم آتے ہیں رسول دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے جنھوں سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اتر جائے	آتا ہوا دہر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے
اقہ پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے	دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے

مریم سے سوا حق نے شرف انکو دیئے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں

دربان عصا اٹھا کے بڑھے جانب لسیار
آ آ کے در پہ لونڈیاں چلائیں بار بار

دہنی طرف نقیب گئے باندھکر قطار
آئے ادہر نہ اب کوئی جائے ہو ہشیار

آواز غیر سن کے وہ اندیشہ کرتی ہے
آہستہ لو دختر زہرا اترتی ہے

عفت کے جتنے مرتبے خیر النسا نے پائے
وہ ماں کی بعد دختر مشکلکشا نے پائے

ہاں ہاں مسافرو نہ کوئی غل مچا نے پائے
ناقہ پہ بیٹھکر نہ ادہر کوئی آنے پائے

حسن ادب یہی ہے کہ حق کو پسند ہو
وہ بیٹھ جائے جس کا کہ قامت بلند ہو

دونوں بزرگوں نے عورتوں کی پردہ کے اہتمام کا سماں باندھا ہی لیکن میر صاحب نے اس مضمون کو اس فصاحت و بلاغت سے ادا کیا ہی اور اس طرح واقعہ کی تصویر کھینچدی ہے کہ اسکے سامنے مرزا صاحب کے اشعار کا پیش کرنا بھی، میر صاحب کی ناقدردانی ہی، روانی شستگی، خوبی محاورہ چستی بندش، کے علاوہ بلاغت کے نقطوں پر لحاظ کرو، میر صاحب نے پردہ کی اہتمام اور لوگوں کی ہٹانی اور روکنی کو حضرت عباس کی طرف منسوب کیا ہی جس سے حضرت زینب کی عظمت و شان کی اظہار کے علاوہ اصلی واقعہ کی مطابقت ہوتی ہی، کیونکہ تمام معزز خاندانوں میں پردہ کا اہتمام خوخاندان کی بمسو کیا کرتی ہیں بخلاف اسکے مرزا صاحب نے یہ کام بالکل دربانوں، نقیبوں، اور لونڈیوں کی سپرد کردیا ہی جس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہی کہ یا تو گھر میں کوئی مرد تھا ہی

نہیں، یا تھا تو اس کو عورتوں کی چنداں پرواہ نہ تھی، پردہ کے اہتمام میں نقیبوں کا کیا کام ہے، لونڈیوں کے غل مچلنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ادب و شائستگی نہیں پائی جاتی ذیل کے یہ دونوں مصرعے بالکل ہم مضمون ہیں لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ؎

انیس ناقہ پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے،
دبیر ناقہ پہ بیٹھ کر نہ ادھر کوئی آنے پائے،

صغریٰ کی آرزو

صغریٰ نے کہا صاحبو کیا کرتے ہو گفتار شاید کہ سفر ہی میں شفا دے مجھے غفار	دبیر اک بات پکڑلی کہ یہ بیمار ہے بیمار یاں کون خبر لیگا مری یہ در و دیوار
اتنی بھی تو طاقت نہیں جو اٹھ کے کھڑی ہوں اے لوگو! میں کیا آپ سے بیمار پڑی ہوں	

واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام تمام تر اہل حرم کو ساتھ لیے جاتے ہیں لیکن حضرت صغریٰ کو بیمار ہونے کی وجہ سے چھوڑے جاتے ہیں۔ اس پر وہ گریہ و زاری کرتی ہیں حضرت امام حسینؑ اور گھر کی عورتیں سمجھاتی ہیں کہ تم بیمار ہو سفر کے مصائب برداشت نہیں کر سکتی ہو صغریٰ جواب دیتی ہیں۔ اسی مضمون کو میر انیس صاحب ادا کرتے ہیں ؎

کیا خلق میں لوگو! کوئی ہوتا نہیں بیمار زندہ ہوں پہ مردہ کی طرح ہو گئی دشوار	ہے کونسی تقصیر کہ سب ہو گئے بیزار کیوں بھاگتے ہیں سب مجھی سے کونسا آزار
حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اسکا وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا	

مرزا صاحب نے بھی عمدگی سے اس واقعہ کو ادا کیا ہے لیکن میر صاحب کے طرز بیان میں جو حسرت رنج اور بیکسی ہے وہ مرزا صاحب کے ہاں نہیں۔ "اک بات پکڑلی" عامیانہ اور سوقیانہ طرز گفتگو ہے۔ ٹیپ کے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں اور یہ کہنا کہ مجھ کو اٹھنے کی بھی طاقت نہیں صغرؑ کی خواہش پر ناکامی کا اثر پیدا کرتا ہے کیونکہ جب اٹھنے کی طاقت نہیں تو وہ سفر کیونکر کر سکتی ہیں؟

اسی بنا پر میر انیس نے جہاں یہ واقعہ بیان کیا ہے صغرؑ کی زبان سے یہ کہا ہے ؎

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت
تپ کی بھی ہے شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت
پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت

حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقین ہے
اب تو میرے منہ کا بھی مزا تلخ نہیں ہے

دیکھو حضرت صغرؑ کس طرح سے بیماری کی تخفیف اور قریب الصحتہ ہونیکو ثابت کرتی ہیں

اصغرؑ سے خطاب،

پردہ اٹھا کر یہ کہا بانو نے رو رو
صدقے گئی فال ایسی تو منہ سے نہ نکالو
سب جیتے ہیں بیکس نہ ابھی آپ کو سمجھو
شبیرؑ ہو۔ دنیا ہو۔ ترا کنبہ ہو۔ تو ہو

کب میں نے کہا یہ نہیں اصغرؑ ہے تمہارا
لو شوق سے دیکھو یہ برادر ہے تمہارا

پھر ہاتھوں پہ اصغرؑ کو رکھا کر کے یہ زاری
لٹکا دیئے ہاتھ اس نے بہک کر کئی باری
ماں نے کہا لو گود میں یہ آتے ہیں واری
اصغرؑ کی طرف ہاتھ اٹھا کر وہ پکاری

پھر جیتی ملوں یا نہ ملوں تجھ سے بلا لوں

آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں

صغرؑ کو رخصت کے وقت علی اصغرؑ کو حسرت اور پیار سے دیکھنا نہایت دردانگیز سماں ہے اور اکثر مرثیوں میں یہ سماں نہایت موثر طریقہ سے دکھایا جاتا ہے۔ لیکن مرزا صاحب ایسے دردانگیز واقعہ کو بھی تاثیر کا رنگ نہ دے سکے۔ دیکھو میر صاحب اسی بات کو کس لہجہ سے ادا کرتے ہیں ؎

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرؑ ترے قرباں
گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جاں

بے کس مری بچی ترا اللہ نگہباں
صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آں

کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
کنبہ کے لئے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس کر و گریہ و زاری
اصغرؑ مرا روتا ہے صدا سن کے تمہاری

وہ کانپتی ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری
آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری

پھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغرؑ مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
تپ ہے تمہیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی

جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی
رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمہیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

اس واقعہ کا نہایت دردانگیز پہلو اصغرؑ سے مخاطب ہونا، اور جوشِ محبت میں چھ مہینہ کے بچے سے اپنا دردِ دل کہنا تھا۔ مرزا صاحب صرف یہ کہہ کر رہ گئے ع

آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالوں، میر صاحب نے پورا اور دو دل کہا اور کس موثر طریقہ سے کہا، مرزا صاحب کا یہ مصرع سنکر ہی طرف ہاتھ اٹھا کر وہ پکاری، میر صاحب کے اس مصرع کے جواب میں ہے ع وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری، لیکن دونوں میں کوئی نسبت نہیں، میر صاحب کے ہاں ہاتھ کے ساتھ کانپنے کی قید نے کس قدر بلاغت پیدا کر دی ہے، ذیل کے ان دونوں مصرعوں میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے،

ع آ میرے ننھے سے مسافر ترے واری، "آ آ میرے ننھے سے مسافر تجھے واری"

ع آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالوں، "چھوٹا مسافر" مرزا صاحب کا ایجاد ہے،

اعلیٰ و ادنیٰ کا مقابلہ

کچھ خار مغیلان گل تر ہو نہیں جاتا	ایں	قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا
ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا		مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا

جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

میر ایں کا یہ مشہور بند ہے، مرزا صاحب نے اس کے جواب میں بڑی کوشش کی، مختلف بحریں اختیار کیں، بہت سی نئی نئی تشبیہیں ڈھونڈیں لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی، مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

احکام ترے حق ہیں اور اپنے امور اور		باطل کی نمود اور ہے، اور حق کا ظہور اور
نمرود کی آگ اور ہے اور آتش طور اور		زنبور کا غل اور ہے، الحان زبور اور

سمجھو تو سہی تم کہ بشر کیا ہے ملک کیا
بُت کیا ہے، خدا کیا ہے، زمین کیا ہے فلک کیا

سامان سے کوئی صاحب ایمان نہیں ہوتا
ہر اہل عصا موسیٰ عمراں نہیں ہوتا
پہنے جو انگوٹھی وہ سلیمان نہیں ہوتا
آئینہ گر اسکندر دوراں نہیں ہوتا

لاکھ افوج ہو پشہ کا ہما ہو نہیں جاتا
بُت سجدۂ کافر سے خدا ہو نہیں جاتا

یہ تشبیہات کافی نہ ہوئیں تو ایک اور مرثیہ میں بہت سی تشبیہیں جمع کیں ؎

ہر سبز پوش خضر نہیں عزو جاہ میں
سرسبز حیدری ہیں جناب آلہ میں
یوسفؑ نہ ہوگا لاکھ گرے کوئی چاہ میں
دن رات کا ہے فرق سفید و سیاہ میں

کوئی یتیم فاطمہؑ سا خوش گہر نہیں
ہر اک یتیم در یتیم اے عمر نہیں

چاہے زرہ بنا کے جو داؤد کا وقار
واللہ جعلساز ہے کیا اس کا اعتبار
ہر چند گر نہ ہو، کبھی اور لیس نامدار
ہر ناخدا کو نوح کہے گا نہ ہوشیار

کیا جاہلوں کے عیش کا سامان ہو گیا۔
بیٹھا جو تخت پر وہ سلیمان ہو گیا

حر کا واقعہ

حُر پہلے یزید کی طرف تھا، لیکن خدا نے ہدایت دی، اور معرکہ جنگ شروع ہونے سے پہلے، وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی فوج میں چلا آیا، اس کا آنا معافی کا خواستگار ہونا، لڑنے کی اجازت طلب کرنا، زخمی ہو کر گرنا، امام علیہ السلام کا اُس کے پاس جانا، اُس کا انتقال کرنا، یہ واقعات اکثر مرثیوں میں دونوں نے لکھے ہیں

لیکن ایک مرثیہ میں بحر اور اکثر قافیے تک مشترک ہیں، ان دونوں مرثیوں کے مقابلہ کرنے سے دونوں حریفوں کے مدراج کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے ؎

کہہ کے یہ گھوڑوں پہ غازی ہوئے دونوں اسوار	مرزا دبیر	پہنچے نزدیک شہ دیں تو پکار احرار
اور چلے شاہ کی جانب کو بڑھا کر رہوار		بخشدے جرم شہنشاہ بخف کے دلدار
روئے الطاف کو ہم سے نہ پھیرا نا آقا		
نہیں اس در کے سوا کوئی ٹھکانا آقا		
ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار	انیس	مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کے نہیں جسکے شمار
الغیاث اے جگر و جان رسول مختار		عفو کر عفو کر اے چشمۂ فیض غفار
پار دریائے خطا سے مری کشتی ہو جائے		
دوزخی بھی ترے صدقے سے بہشتی ہو جائے		
واسطہ احمد و زہرا و حسن کا اے شاہ	دبیر	بخشدو عفو کرو بندۂ عاصی کا گناہ
نذر سر لایا ہوں مقبول ہو اے عرش پناہ		اور بتا دو مرے بیٹے کو بھی فردوس کی راہ
حر عوض آپکے مقتول جفا ہوئے گا		
اور اکبر پہ مرا لال فدا ہوئے گا		
کئی روزوں سے تلاطم میں موں اے شاہ شہنشاہ	انیس	مدد اے نوح غریباں مرا بیڑا ہے تباہ
دست و پا گم ہیں کچھ ایسے کہ نہیں سوجھتی راہ		شور کرتا ہوں کہ بتلائے کوئی جائے پناہ
ابر رحمت کی طرف جا، یہ صدا دیتے ہیں۔		
سب ترے دامن دولت کا پتہ دیتے ہیں		
پیشوائی کو چلے حر کے شہنشاہ زمن	دبیر	ہاتھ کھولے پسر عقدہ کشا نے فوراً

کانپ کر پائے مبارک پہ جھکا سر فگن | سر اُٹھا کر کیا سرور نے یہ بھائی سے سخن

گو سر حُر پہ ہے خالق کے کرم کا سایا
آن کر تم بھی کرو اس پہ علم کا سایا

استغاثہ یہ کیا حُر نے جو با دیدۂ نم | جوش میں آگیا اللہ کا دریائے کرم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلائے شہنشاہ امم | حُر کو یہ ہاتفِ غیبی نے صدا دی اسدم

شکر کر سبط رسول الثقلین آتے ہیں
اے برادر ترے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیرؑ | دوڑ کر چوم لیے پائے شہِ عرش سریر
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے با توقیر | میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر

میں رضامند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو
مجھ کو عباسؑ دلاور کے برابر ہے تو

حُر نے فرزند پیمبر سے یہ اس وقت کہا | دبیر | سایہ دامنِ رایت تو ہے ظلِ طوبیٰ
آپ کی بندہ نوازی پہ فدا اے آقا | رُخ کیا جب سے اِدھر کا یہ ہے الطاف خدا

مرحبا فاطمہ زہراؑ مجھے فرماتی ہیں
سایہ چادر کا مرے سر پہ کیے آتی ہیں

حُر پکارا بابی انت و امی یا شاہ | انیس | قابلِ عفو نہ تھے بندہ آثم کے گناہ
مجھ سے گمراہ کو اک آن میں ملجائے یہ راہ | سب ہے صدقہ انہیں قدموں کا خدا ہی آگاہ

مہر ذرّہ پہ جو ہو منیر تاباں ہو جائے
آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے

عرض کی پھر شہ والا سے بہ جوشِ رقت
عفو تقصیر ہوئی اب ہو عنایت رخصت

دبیر
کرتے ہیں دشمنِ دیں جنگ پہ اسدم سبقت
دیکھنے کی نہیں بندے میں ذرا اب طاقت

گر رضا پائے تو سر اپنا کٹائے فدوی
زخمِ شمشیر و سنانِ سینہ پہ کھائے فدوی

لائے اس عزت و حرمت سے جو مہمان کو امام
شہ نے فرمایا مناسب ہے کوئی دم آرام

انیس
بولے عباسؑ کمر کھول اب اے نیک انجام
عرض کی حُر نے کمر خلد میں کھولیگا غلام

فاتحہ پڑھ کے یہ شمشیر و سپر باندھی ہے
آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہے

ہے بہت شمر و عمرو سے مجھے لڑنیکی اُمنگ
لشکرِ شام سے پہم چلے آتے ہیں خدنگ

ایک ہی وار میں دونوں کو کروں گا چور نگ
شاہزادوں کی سپر ہوں کہ عبا دے ہے یہ جنگ

کہیں ایسا نہ ہو بچہ کوئی بیجاں ہو جائے
پہلے یہ تازہ غلام آپ پہ قربان ہو جائے

پسرِ حُر کے معرفِ علی اکبر تھے کہ واہ
دونوں تسلیم کنان صرف دعا تھے ذیجاہ

دبیر
حُر کو دیتے تھے صدا شاہ کہ سبحان اللہ
مژدۂ گلشنِ جنت انہیں پہنچا ناگاہ

دونوں یک مرتبہ بیزار ہوئے جینے سے
نیزۂ ظلم و ستم پار ہوئے سینے سے

بڑھ کے فرماتے تھے عباسؑ سے زہے عزت و جاہ
کہتے تھے ابن حسن واہ حُر غازی واہ

انیس
بارک اللہ کی دیتا تھا صدا دلبر شاہ
شاہ ہر ضرب پہ فرماتے تھے سبحان اللہ

اپنی جانبازی کا غازی جو صلہ پاتا تھا

مسکراتا ہوا تسلیم کو جھک جاتا تھا

اُس گھڑی فاطمہؑ کے لال سے حُر نے یہ کہا
شیرِ حق میرے سرہانے ہیں کھڑے ہیں مولا

دُر
آپ کے صدقے سے یہ رتبہ ہوا خادم کا
جام کوثر لئے کہتے ہیں بصد لطف و عطا

لے اسے پی کہ بہت تشنہ دہن ہے اے حُر
جلد آ دیکھ یہ جنّت کا چمن ہے اے حُر

اُن سے ہیں عرض یہ کرتا ہوں کہ اے شاہِ زماں
صبح سے گھر میں ہیں بیہوش ہے اصغر ناداں

پسرِ فاطمہ پیاسا ہے مجھے پیاس کہاں
تشنہ لب ہے کئی دن سے علی اکبر سا جواں

پیاسا ہوں، اس پہ بھی پانی نہ پیوں گا مولا
جام کوثر نہ بن آقا کے پیوں گا مولا

نیم وا چشم سے حُر نے رُخِ مولا دیکھا
مُسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا

انیس
زیرِ سر انوے شبّیر کا تکیہ دیکھا
شہ نے فرمایا کہ اے حُر بھری کیا دیکھا

عرش کی حُسن رُخِ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

مجھ کو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ
خلد سے شیرِ خدا نکلے ہیں اللہ اللہ

ملک الموت بھی ڈرتا ہے محبت کی نگاہ
لو برآمد ہوئے شبّر بھی پدر کے ہمراہ

ننگے سر احمدِ مختارؐ کی پیاری آئی
دیکھئے آپ کے نانا کی سواری آئی

حُر کے عبّاسؑ دلاور کو پکارے سرور
گئے عبّاسؑ اُدھر، یاں ہوا برپا محشر

روک لو تم کہ سکینہؑ علی آتی ہے اِدھر
حُر بھی فرزند بھی حُر کا ہوا گویا رد کر

عشق پہ غش تشنہ دہانی کے سبب آتے ہیں
افتراق اب چمنِ خلد کو ہم جاتے ہیں

قبلہ رو کیجئے لاشہ مرا اے قبلۂ دین
کورچ نزدیک ہے اے بادشہ عرش نشین

پڑھیئے لیٹیں کہ اب ہی یہ دمِ بازپسین
لیجئے منہ سے نکلتی ہے مری جان حزیں

بات بھی اب تو زبان سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اُڑھا دیجئے مولا مجھے نیند آتی ہے

کہہ کے یہ گود میں شبیر کے لی انگڑائی
آیا ماتھے پہ عرق، چہرہ پہ زردی چھائی

شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی
چل بسے سرور جری، پھر نہ کچھ آواز آئی

طائرِ روح نے پرواز کی طوبا کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہ والا کی طرف

میر انیس کے اشعار میں بلاغت کی جو باریکیاں، اور دقایق ہیں اُنسے ہم اس موقع پر بحث نہیں کرتے، یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ حسنِ بندش سے کلام میں کس قدر صفائی، پرجستگی اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔

قیدخانہ کے واقعات | قیدخانہ کا حال، اور ہند کے آنے کا واقعہ دونوں نے لکھا ہے اور ایک بحر میں لکھا ہے۔ میر انیس کا مطلع ہے مصرع جب قیدیوں کو خانۂ زندان میں شب ہوئی، اور مرزا صاحب کا مطلع ہے مصرع جب قیدیوں کو راہ میں ماہ صفر ہوا، میر انیس نے تفصیلی حالات نہایت مؤثر پیرایہ میں لکھے ہیں، مرزا صاحب کے ہاں صرف ۳۶ بند ہیں لیکن بعض مضامین مشترک ہیں وہ ملاحظہ ہوں ؎

راوی نے حال خانۂ زندان یوں لکھا | میر وحشت میں مثل قبر اور آفت میں کربلا

آئی جو شب اسیر کو صدمہ بڑا ہوا — نہ فرش تھا نہ سایہ تھا نہ پانی نہ غذا
شمعوں کی روشنی نہ چراغوں کی روشنی
بس ماتم حسینؑ کے داغوں کی روشنی

کیجئے شکستگی خرابہ کا کیا بیان — انیس ثابت نہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائباں
وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں — وہ شب کہ الحذر وہ اندھیرا کہ الاماں
ظلمت سرائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا

ناگاہ مشعلوں کی ہوئی روشنی نمود — دبیر اور غل ہوا کہ ہند کا زنداں میں ہے ورود
زینبؑ کے دل پہ صدمہ سا بھوں سے ہوا فزود — غربت سے کانپنے لگی وہ خاصہ دودو
سر زانوؤں کے بیچ میں شرما کے دھر لیا
اور بیڑیوں کو خاک میں پوشیدہ کر لیا

بچوں سے پھر وہ بولی وہ آفت کی مبتلا — اب نام لیجیو نہ مرا تم پہ میں فدا
ناگاہ آئی قیدیوں میں ہند باوفا — زنجیر پہنے دیکھ کے عابدؑ کو دی ندا
بیدادِ اہلِ ظلم سے یارب دہائی ہے
اس ناتواں کو آہ یہ بیڑی پہنائی ہے

نکلی محل سرا سے یہ کہہ کر وہ خوش سیر — انیس تھیں ساتھ ساتھ چند خواصیں بھی نوحہ گر
پہنچی جناب حضرتِ زینبؑ کو یہ خبر — رنگ اڑ گیا یہ کہنے لگی سر کو پیٹ کر
اپنا نہیں خیال، بزرگوں کا پاس ہے
ہے ہے کہاں چھپوں وہ مری روشناس ہے

ہے شرم کی جگہ کہ میں ہوں خواہر امام — غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام
ہم ہیں فقیر ہم میں امیروں کا کیا ہے کام — لوگو بتا نہ دیجو کہیں اس کو میرا سلام

پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینبؑ کدھر گئی
کہہ دیجیو کہ بھائی کے ہمراہ مر گئی

زینبؑ کو بھی سکوت کا یارا نہ پھر رہا — دبیر — بولے نہ ان سے پوچھ یہ زینبؑ کا ماجرا
کیا جانیئے کہ بعد حسینؑ اس پہ کیا ہوا — قدموں پہ ہند گر پڑی پہچان کر صدا

رو کر کہا قسم تجھے ربِ قدیر کی
زینبؑ تمہیں ہو بیٹی جناب امیر کی

یہ سن کے ہند رونے لگی تب بہ اشک و آہ — انیس — پھر مڑ کے روئے حضرتِ زینبؑ پہ کی نگاہ
منہ سے نہ اٹھائے بال تو حالت ہوئی تباہ — بیساختہ کہا کہ زہے قدرت الٰہ

ہرگز غلط نہیں جو تجھے اشتباہ ہے
زینبؑ تمہیں ہو خالقِ اکبر گواہ ہے

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ میں عموماً میر انیس کی ترجیح ثابت ہوگی۔ لیکن ہر کلیہ میں مستثنیٰ ہوتا ہے۔ بعض موقعوں پر مرزا دبیر صاحب نے جس بلاغت سے مضمون ادا کیا ہے میر انیس سے نہیں ہو سکا چنانچہ ذیل کی مثال سے اس کی تصدیق ہوگی۔

حضرت علی اصغر کے لئے پانی مانگنا

واقعات کربلا میں یہ واقعہ نہایت درد انگیز ہے کہ تمام اعزہ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے شش ماہہ بچے (علی اصغرؑ) کو دشمنوں کے سامنے لیجا کر اسبات کے ملتجی ہوئے کہ یہ بچہ پیاس سے مرتا ہے۔ اسکے گلے میں پانی کی ایک بوند

ٹپکا دو، اس واقعہ کو میر ضمیر سے لیکر آجتک نئے نئے مؤثر پیرایوں میں ادا کیا جاتا ہے
میر انیس صاحب نے مختلف مرثیوں میں یہ واقعہ لکھا ہے، اور ہر جگہ نیا پہلو اختیار
کیا ہے، ایک مرثیہ میں جو سب سے بہتر ہے فرماتے ہیں ؎

بولے دکھا کے بچہ کو شاہ فلک سریر
مرتا ہے پیاس سے یہ مرا کودک صغیر
پانی ملا ہے کل سے نہ ممکن ہوا ہے شیر
للہ اس غریب پہ کر رحم اے امیر

مہماں ہے کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہے
اس کا قصور کیا ہے کہ یہ بے زبان ہے

بر پا ہے اہل بیت محمد میں شور و شین
در پر پھوپھی بلکتی ہے ماں کر رہی ہے بین
آنکھیں پھرائے دیتا ہے اب تو یہ نور عین
لایا ہے اس عطش میں ترے پاس اب حسین

تجھ کو قسم ہے روح رسالت مآب کی
ٹپکا دے اسکے حلق میں اک بوند آب کی

لیکن مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی
ہے اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے کسی سے آج تک نہ ہو سکا، فرماتے ہیں ؎

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفےٰ
لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا
نہ مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا
منت بھی کر کرونگا تو کیا دین گے دوا

پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرہ سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھپکا کے بولے کہ یہ ہمکو لاتے ہیں
اصغرؑ تمہارے پاس غرض لیکے آتے ہیں

گر میں بہ قول عمرو شمر ہوں گناہ گار
شش ماہہ بے زبان بنی زادہ شیر خوار
یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصور دار
ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہی شیر خوار

سن ہی جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بیزبان ہے تمہیں کچھ خیال ہے
در نجف ہے بانوئے بیکس کا لال ہے
لو مان لو، تمہیں قسم ذوالجلال ہے
یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے

پوتا علیؑ کا تم سے طلبگار آب ہے
دیدو کہ اسمیں ناموری ہی ثواب ہے

پھر ہونٹ بے زبان کی چومے جھکا کے سر
روکر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھادو نکال کر

پھیری زبان لبوں پہ جو اُس نورعین نے
تھرا گئے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

۳۔ اسلوب بیان کی بلاغت کو دیکھو، امام علیہ السّلام، اصغر کو لیکر پانی مانگنے کو نکلے تو سہی لیکن غیرت کے اقتضاء سے ہر قدم پر ٹھہر جاتے ہیں کہ سوال کیونکر کروں، اور کروں بھی تو نتیجہ کیا ہوگا، پھر فوج کے قریب پہنچکر سوال کرتے ہوئے شرمانا، تھرا کے رہ جانا، اور سب سے بڑھ کر بچہ کے چہرہ سے چادر سرکا کے رہ جانا، کس قدر قیامت انگیز سماں ہے، پھر سوال بھی کرتے ہیں تو علی اصغرؑ پر رکھ کر ع اصغر تمہارے پاس غرض

لے کے آئے ہیں، واجب الرحم ہونے کی وجہیں کسقدر لاجواب ہیں، اور سب ایک ہی مصرع میں ادا ہوگئی ہیں یعنی شیشمانہ ہے بے زبان ہے، بی زادہ ہے شیر خوار ہے ان سب پر قیامت یہ کہ جب سب کچھ کہہ چکے تو بچہ کی زبان حال سے بھی کہلوایا اور بچہ نے بھی کہہ دیا، کیونکہ بچہ پیاس کی شدت سے لبوں پر زبان پھیر اکرتا تھا، اب بھی اُسنے ایسا ہی کیا تو یہ زبان حال سے کہنا تھا ہم

متحد المضمون اشعار

اس قسم کے اشعار بعض تو بالکل ہم مضمون ہیں، بعض اس قسم کے ہیں کہ ایک نے ایک خیال کو ادا کیا تھا، دوسرے نے اس کو ترقی دینا چاہا، بعض ایسے ہیں کہ صرف اصل واقعہ مشترک ہے اور دونوں کی طرز ادا الگ الگ ہے، چنانچہ ہم ہر قسم کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں ؎

مثل تنور گرم تھا پانی میں ہر احباب	دبیر	ہوئی مچھلیں سیخ موج پہ مُرغابیاں کباب
پانی تھا آگ، گرمی روز حساب تھی	انیس	ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

یہ مضمون دونوں کے ہاں مشترک ہے کہ گرمی کی شدت یہ تھی کہ موج سیخ بن گئی تھی اور جب کوئی جانور اسکے پاس جاتا تھا تو جل کر کباب ہو جاتا تھا، بندش اور الفاظ کی نشست میں جو فرق ہے وہ خود ظاہر ہے لیکن معنوی حیثیت سے بھی میر انیس کا شعر بڑھا ہوا ہے۔

میر انیس صاحب کے ہاں گرمی کا مبالغہ جو شعر کی جان ہے زیادہ پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ مچھلی سیخ موج تک آنیکے ساتھ فوراً کباب ہو جاتی تھی۔ مرزا صاحب کے ہاں یہ بات نہیں پائی جاتی وہ کہتے ہیں کہ موج کی سیخ پر مرغابیوں کا کباب لگایا

جاتا ہے اس سے فوراً کباب ہو جانے کا خیال نہیں پیدا ہوتا ۵

چاہوں تو بیٹھے بیٹھے، اک انگلی سے زمین پر	دبیر	گردوں کی ڈھال چیر کے کھدوں زمین پر
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی	انیس	رکھدوں زمین پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

مرزا صاحب کے شعر کا پہلا مصرع نہایت بدنما ہے اس کے علاوہ ایک انگلی سے چیرنا نہیں ہوتا بلکہ کھرچنا دینا ہوتا ہے ڈھال کی تشبیہ آفتاب سے بہ نسبت آسمان کے زیادہ موزوں ہے ۵

دہشت سے جو ان بھاگتے تھے تیر کی مانند	دبیر	تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کی مانند

انیس چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر؛

میر صاحب کا مصرع زیادہ فصیح اور صاف ہے، ان الفاظ سے کانپنے تھے۔ جو تصویر خیال میں کھچ جاتی ہے وہ رعشہ کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی، سب سے بڑھکر یہ کہ جبتک چلنے کی قید نہ مذکور ہو پوری تشبیہ نہیں ہوتی، کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی کی حالت میں کانپتے ہیں، اسکے ساتھ چونکہ چلنے کا اطلاق پاؤں اور نیزہ دونوں پر ہوتا ہے اس لئے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے، سب سے بڑھکر یہ کہ نیزہ چلانے کی حالت میں نیزہ کو لچک ہوتی ہے اسلئے اسکو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا نہایت لطیف حسن التعلیل ہے۔ بخلاف اسکے کہ مرزا صاحب نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا اس لئے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

دبیر چلائے ہاتھ مل کے جلا جل کہ الامان؛

انیس ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو بلا جل خاموش؛

جلا جل کے دونوں حصے جو بجاتے ہیں ملجاتے ہیں، اسکی تعبیر دونوں بزرگوں

نے دو طرح پر کی ہے مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جلا جل چلا کر الامان کہتا تھا اور ہاتھ ملتا تھا لیکن چلانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں، اسلئے گو تشبیہ صحیح ہے لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی، میر صاحب کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کا رعب اسقدر غالب ہوا کہ جلا جل ہاتھ جوڑ کر چپ ہو گیا، رعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے، اور چونکہ جلا جل کے دونوں حصے جب ملجاتے ہیں تو پھر جبتک جدا نہ ہوں آواز نہیں دے سکتے، اسلئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ ہاتھ جوڑ کر چپ ہو گیا ؎

یوں چشم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں	دبیر	جیسے مکان سے زلزلہ میں صاحب مکان
یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے	انیس	جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

اصل مضمون یہ ہے کہ روحیں جسم سے اسطرح بھاگ گئیں جسطرح بھونچال میں کوئی گھر چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے، لیکن بندش کی صفائی اور برجستگی نے میر انیس صاحب کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اسکے علاوہ، صاحب مکان کی تخصیص بالکل بیکار ہے، زلزلہ جب آتا ہے تو صاحب مکان کی کوئی تخصیص نہیں، ہر شخص مکان چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے جسم رعشہ دار کی ترکیب نامانوس ہے اور اس قید سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صرف اُن لوگوں کی روحیں نکلیں جنکے جسم رعشہ دار تھے۔ میر صاحب کا پہلا مصرع بھی کچھ اچھا نہیں، سر کا لفظ بالکل حشو ہے مگر موقع کے لحاظ سے غلط ہے، روح سر میں نہیں رہتی اور نہ سر سے اس کو کوئی خصوصیت ہے۔ ؎

وہ رخش پہ یا دیو تھا اسواری پہ کہ	دبیر	اک بدن میں اُٹھا کوہ چڑھا کبک دری پر

کسقدر بیہودہ تشبیہ ہے دشمن کو کوہ اور گھوڑے کو کبک دری کہنا مضائقہ نہیں لیکن کوہ کا کبک دری پر چڑھنا کسقدر مہمل ہے امیر انیس صاحب نے بھی یہی

مضمون یعنی دشمن کا گھوڑے پر سوار ہونا متعدد موقع پر باندھا ہے، اور کس خوبی سے باندھا ہے،

ع گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا۔
ع گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا۔

رن میں جو گہرا ابر غلیظ اہل سفر کا	دبیر	بجلی سا کڑکنے لگا کڑکیت عسرو کا
گرد عباس کے کثرت تھی ستمگارونکی		مینہ تو تیروں کا تھا اور برق تھی تلواونکی

پہلے شعر کا یہ مطلب ہے کہ دشمن جو اہل سفر تھے، اُن کے صفوں کا دل ابر غلیظ تھا اور اُس ابر میں کڑکیٹ کا کڑکنا بجلی کا کام دیتا تھا، دوسرے شعر کا مطلب ظاہر ہے اسی طرح کے مضمونوں کو میر انیس صاحب نے باندھا ہے ؎

اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے ستمگارونکی		برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

مرزا صاحب کا پہلا شعر تو بالکل بھدا اور بدترکیب ہے، دوسرا ذرا صاف ہے لیکن میر انیس صاحب کے شعر سے اس کو بھی کچھ نسبت نہیں ہے، صفائی اور برجستگی کے علاوہ "چمکنے لگی" کے جملہ تعلیہ نے جو حالت پیدا کی ہے وہ "برق تھی" سے کہاں پیدا ہو سکتی ہے ؎

عالم ہے مگر کوئی دل صاف نہیں ہے	دبیر	اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے
دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے	انیس	انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

انصاف سے دیکھو مرزا صاحب نے میر صاحب ہی کے لفظوں کو اُلٹ پلٹ کیا ہے لیکن کس بُری طرح سے کہ محض لفظی گورکھ دھندا رہ گیا ہے۔

دبیر کس نے دی انگوٹھی رکوع و سجود میں۔

انیس سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں ؎

دونوں مصرعوں کی شستگی برجستگی اور صفائی میں جو فرق ہے وہ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے ؎

کس آب و تاب سے یہ سر فوج پر گئی	دبیر	پانی کا بن کے گھونٹ گلے سے اتر گئی
سب نشہ غرور جوانی اتر گیا	انیس	تلوار تھی کہ حلق سے پانی اتر گیا

ان دونوں شعروں کا فرق بھی ظاہر ہے۔

یوں متصل رسن سے بندھے تھے دل فگار	دبیر	رشتہ میں جیسے دانۂ تسبیح آبدار

اہل حرم جو ایک ہی رسی میں قید کئے گئے اس کو تسبیح کے دانہ اور رشتہ تسبیح سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ بجائے خود بری نہیں، لیکن میر صاحب کی تشبیہ دیکھو ؎

گردن میں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن		جسطرح رشتہ گلدستہ میں گلہائے چمن

تشبیہ کی لطافت اور نزاکت کے علاوہ، اصل تشبیہ میں کسقدر فرق ہے، تسبیح کے دانے رشتہ میں بندھے نہیں ہوتے بلکہ پروئے ہوتے ہیں، بخلاف اس کے گلدستہ میں پھول رشتہ سے بندھے ہوتے ہیں، بندش کی صفائی کا جو فرق ہے وہ ظاہر ہے، اسکے علاوہ مرزا صاحب کے ہاں آبدار کا لفظ محض فضول اور بیکار ہے ؎

بے جرم معرکہ میں وہ خار اشگاف تھی	دبیر	لشکر کا خون کیا تھا مگر پاک صاف تھی

مرزا صاحب نے اس مضمون کو نہایت خوبی اور صفائی سے ادا کیا ہے، میر انیس صاحب نے اس مضمون کو کئی طرح سے پلٹا لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ بات نصیب نہ ہوئی میر صاحب کہتے ہیں ؎

انیس ان سب کے بعد منہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

انیس جو چاہے دیکھ لے مرا منہ پاک صاف ہے

دم میں نہ وہ غرور، نہ وہ خود سری رہی	انیس	مجرم وہی رہا، یہ خطا سے بری رہی
روکش خدا کی فوج سے چھوٹے بڑے ہوئے	دبیر	سجادہ سے امام زمن اُٹھ کھڑے ہوئے
تیار جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوئے	انیس	تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے
روشن پدر کا زور ہے دنیا و دین پر	دبیر	شمشیر تھے جبر میں کٹے جبکہ تین پر
خیبر میں کیا گذر گئی روح الامین پر	انیس	کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

دبیر بندہتی تھی اور کھلتی تھی مٹھی حباب کی۔
انیس کھلتی تھیں، اور جھپکتی تھیں، آنکھیں حباب کی۔

ختم شد